فسانہ
M. ISMAIL

اشاعت کا پہلا سال

شرح چندہ
سالانہ ۸ روپئے
ایک کاپی ۷۵ نئے پیسے

فسانہ

رہنما
بلونت سنگھ

فسانہ میں شائع ہونے والے تمام
ادبی یا نیم ادبی مواد میں نام مقام
واقعات اور ادارے قطعی فرضی
ہوتے ہیں اور حقیقی افراد، مقامات
واقعات یا اداروں سے ان کی
کوئی مطابقت محض ایک اتفاق ہے
جس کے لئے ایڈیٹر، پبلشر یا مصنف
پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی،

مدیر
مسعود احمد

خوشنویس:-
سید احمد حسین

طابع و ناشر:- مسعود احمد
مطبوعہ:- اسرار کریمی پریس الٰہ آباد
ٹائیٹل:- بھارگو پریس الٰہ آباد

دفتر فسانہ ۲۱۶ - دائرہ شاہ اجمل - الٰہ آباد ۳

زکام
ایک سے دُوسرے تک
پہنچتا ہے۔
جوشینا
Joshina
آپ کی زکام سے
حفاظت کرتا ہے یہ
سانس کی نالیوں کو
صاف کرتا ہے چھینکوں
کو روکتا ہے اعضاء شکنی
کو دُور کرتا ہے اور
آرام پہنچاتا ہے۔
ہمدرد دہلی - کانپور - پٹنہ

# اداریہ

"فسانہ" کا تازہ شمارہ پیش خدمت ہے۔ خدا کا فضل وکرم ہے کہ ہمیں اچھے اچھے خریداروں کے ساتھ ساتھ عمدہ مصنفین کا تعاون بھی روز بروز حاصل ہوتا جارہا ہے۔ چنانچہ ہمارا یہ اندازہ بھی غالباً غلط نہیں ہے ابتک کہ فسانہ کا ہر شمارہ اپنے سابق شمارہ سے بہتر اور بڑھ کر ہی سامنے آرہا ہے۔

اس شمارہ میں جن ارباب فن کی تخلیقات ہم پیش کر رہے ہیں وہ سبھی مشہور و معروف ہیں اے حمید، خدیجہ مستور، غلام عباس کی کہانیاں آپ برابر پڑھ رہے ہیں انکے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اِس بار فسانہ میں اکھلن کی ایک تامل کہانی کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے امید ہے کہ ناظرین فسانہ کو یہ کہانی بھی پسند آئے گی۔

شکاریات اور حیرت انگیز کے موضوع پر جو مضامین ہیں وہ بھی دلچسپ اور لائق مطالعہ ہیں فسانہ کا اگلا شمارہ خاص نمبر ہوگا جس کی کہانیاں انشاء اللہ آپ مدت تک فراموش نہ کرسکیں گے۔

ایک
بات
یاد
رکھیئے
کہ
نورانی تیل رجسٹرڈ
دورِ حاضر کی بہترین ایجاد ہے
جس کی ضرورت ہر وقت پڑتی ہے۔
NOORANI
TEL
نورانی تیل
INDIAN
CHEMICAL Co.
درد۔ زخم۔ چوٹ کٹنے جلنے اور
طاقت کی مشہور دوا ہے
انڈین کیمیکل کمپنی مئوناتھ بھنجن یو۔پی
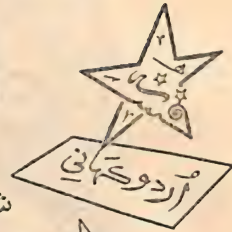
# فہرست
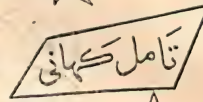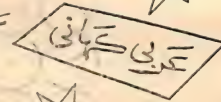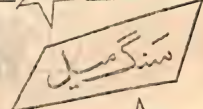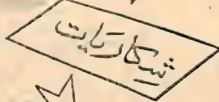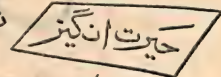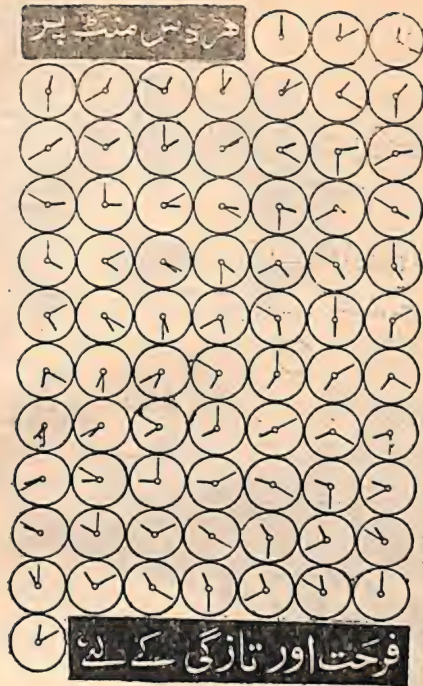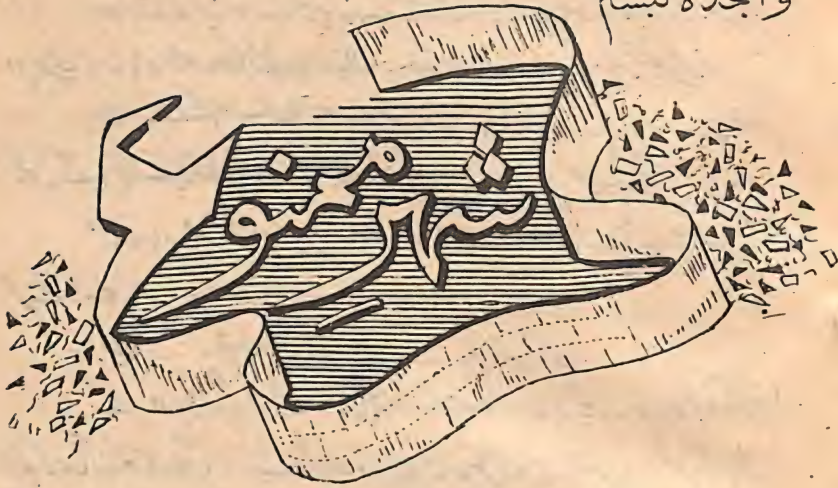
سارا جھگڑا یہ تھا کہ نوری کی گوری گوری پنڈلی پر ایک کالا کالا تل تھا۔ مگر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ بہتوں کی پنڈلیوں پر تل ہوتے ہیں۔

اصل جھگڑا یہ تھا کہ مدن میاں نے نوری کی پنڈلی کا تل دیکھ لیا تھا۔ اصل جھگڑا یہ بھی نہ تھا بات دراصل یوں تھی کہ نوری کی پنڈلی کے تل سے مدن میاں نے اور بھی کئی سلسلے ملائے۔ کچھ یوں سوچا کہ ہو سکتا ہے نوری کے اور بھی کئی جگہ تل ہوں۔ مثلاً کھلے گلے کے کرتے میں سے جو گوری گردن نظر آتی ہے، اس کے اتار پر کسی خوبصورت سے نشیب میں کوئی جم جماتا تل ہو۔ جیسے ادھر اُدھر کے خیال جو آتے چلے گئے تو انھوں نے کہہ سن کے اپنی اماں کو راضی کیا اور پندرہ ہی دنوں کے اندر اندر چٹ منگنی پٹ بیاہ کروالیا۔

اور یہ سب کچھ ہوتا بھی نا اگر اس دن مدن میاں کا اُدبدا کے نماز پڑھنے کو جی چاہ جاتا۔ لگ بھگ چار پانچ بجے کے انداز میں اُنھوں نے عصر کی نماز کے لئے لوٹا اُٹھایا ——
...... پانی بھرا اور وضو بنانے بیچ آنگن جا بیٹھے۔ آنگن کے بازو دیوار تھی۔

دیوار سے لگ کر بیری کا چھتنار درخت تھا۔ جس پر دنادن پتھر برس رہا تھا۔ ایک بیر پٹ سے آ کر ان کے سر پر پڑا، اُنھوں نے سر نہوڑا لیا۔ دوسرا بیر چٹ سے آ کر ان کی پیٹھ پر گرا۔ اُنھوں نے تن تنا کر منہ پھیر کر ایک آدھ گالی بکنی ہی چاہی تھی کہ تڑ سے ایک بیر ان کی ناک

پر آگرا۔ اب تو ان کا ڈھول چھلک گیا۔ چلا کر بولے :۔

"کون تیس مار خانم ہے یہ ——؟ ٹانگ سیدھی کر دوں گا ابھی آکے ۔!"

معلوم تھا گھر میں سوائے لڑکیوں کے ایسی مستی کوئی نہیں بچاتا۔ دھوپوں کی سنساتی دوپہریں ہوں یا جاڑوں کی برفیلی چاندنیاں، یہ چھوکریاں سدا کدکڑے لگاتی پھرتیں۔

مدن میاں کے جواب میں ادھر سے ٹھن ٹھناتی ہوئی نوری آئی —— نیلی شلوار جس کے پائنچے چڑھائے ہوئے۔ لال کھلے گلے کا کرتا، لال اوڑھنی۔ آتے ہی بولی :۔

"ہاں ہاں جھڑ جائیں گے بیر۔ تمہارا کیا جاتا ہے جی —؟ بڑے آئے ٹانگ سیدھی کرنے والے۔"

"اچھا —— تیری اتنی بڑی زبان ——؟ ٹھہر تو سہی"

مدن میاں بڑی گرمی میں آستین چڑھاتے ہوئے نوری پر لپکے۔ سوچا ہوگا نوری اُتا دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوگی —— مگر وہ تو ویسے ہی تنی کھڑی رہی۔ انھوں نے اس کی چٹیا گھسیٹ لی۔

"اب بول —— کرے گی زبان درازی —— ایں —— ؟"

"اوں —— اوں ——" وہ چلائی —— بڑے کہیں کے آئے۔ اس دن بھی لے کے۔ اتنا مارا اور آج بھی چٹیا نوچ ڈالی۔ ابھی اماں سے جا کر کہتی ہوں۔"

مدن میاں سٹ پٹا گئے۔ "یہ پرکالہ چھوکری اب خالہ بی سے جانے کیا کیا جا لگائے" ذرا نرم پڑ کر بولے :۔

"کہاں مارا تمہارے میں نے ؟"

"ہاں ہاں —— اس دن آنگن میں —— "چڑی چھپا کا" کھیل رہے تھے تو کس نے یہ اتنا بڑا بنڈا پھینک کے مارا تھا —— ؟" ایکدم وہ تیکھی ہو کر بولی —— "کیوں جی یہ آنگن تمہارے باپ کا ہے —— ؟"

مدن میاں صاف مکر گئے۔ "جھوٹ بکتی ہے۔ میں نے تجھے تو تجھے کیا آج تک کسی نوکر کے بھی پتھر نہ مارا ہوگا۔"

"اوں —— جھوٹے کہیں کے۔ یہ دیکھو تو ——" اور اس نے جھٹ اپنی نیلی شلوار کا پائنچہ گھٹنوں تک چڑھالیا۔

"یہ دیکھو۔ یہ نیلا نیلا نشان۔ پتھر کی چوٹ کچھ کم نہیں ہوتی۔ جی ـــــ ہاں ـــــ!"
" وہ کمبخت تو پتھر کی چوٹ بتا رہی تھی اور میاں دل چوٹ کھا گیا۔ بڑی اُجلی اجلی، ڈھلی ڈھلی سی پنڈلی تھی ـــــ اور غروب ہوتے سورج کی پیلی پیلی دھوپوں میں نہا کر تو سونا جیسی بن گئی تھی۔ نیل ویل کچھ بھی نہ تھا، ہاں ایک تل ضرور چمک رہا تھا ـــــ کالا کالا۔

اور قبل اس کے کہ مدن میاں کچھ سنبھلتے یا کسی حیلے ٹوٹے سے ابھی تھوڑی دیر اس کی پنڈلی ہی دیکھتے رہتے ـــــ وہ پیر پٹختی، تینوں سر سمیٹتی، اپنی لال لال اوڑھنی کا آنچل لہراتی یہ جا ـــــ وہ جا۔

مدن میاں کئی منٹ تک تو وہیں کھڑے رہے۔ عصر کا وقت ٹلا جا رہا تھا۔ ہڑبڑا کر نماز کو چل دیئے۔

## ایک تھی شہزادی

"ہا ـــــ بیچاری ـــــ" دادی بی کو شہزادی پر بڑا ترس آیا۔ سروتہ پٹخ کر وہ ساکت سی ہو گئیں۔

" تو آگے ہوا کیا ـــــ؟" کسی نے بیچ میں ٹوکا دیا۔

" ارے ہوتا کیا ـــــ! نصیبوں جلی کی قسمت میں تو ٹھوکریں ہی لکھی تھیں کبھی تو بھول کے مسکرانا نصیب نہ ہوا اس کو ـــــ!"

" بھئی اللہ ـــــ دادی بی ـــــ آپ تو ایسے ترس کھا رہی ہیں وہ سچ مچ کی ہوں شہزادی تھی جیسے ـــــ پھر آگے سنائیے نا ـــــ"

" کیا سناؤں ـــــ؟ مجھے نیند آ رہی ہے اب۔" دادی بی نے منہ پھاڑ کر جمائی لی۔

" دادی بی اگر آپ نے کہانی پوری نہ کی نا تو یاد رکھیئے ہم کل آپ کا پاندان چھپا دیں گے پھر لیتی رہیئے گا جمائیاں ـــــ ہاں!"

دادی بی نے پھر ڈوری پکڑی۔

" اے ہے بڑی کرموں جلی تھی۔ پیدا ہوتے وقت کوئی منحوس مارا کھڑا ہو گا تبھی تو۔ اب آ جا کے رانی کو یہی سوجھا کہ نہ سہی کوئی شہزادہ، کسی وزیر زادے ہی سے نکاح پڑھوا دیں۔ اے کرتی بھی کیا بیچاری! بال جو پکتے جا رہے تھے شہزادی کے۔ ادھر رانی چپکے راجہ کی جان کھائے جاتی:۔

"اجی سنتے ہو! لڑکی دکھائی نہیں دیتی سامنے ــــ؟ جیسے سفید دانت ہیں ایسے ہی سفید بال بھی ہولیں، تب اُٹھانا۔ ہاں آگے تم جانو۔"

"مگر آج کہاں سنتا اس کی بات۔ وہ تو محل میں بھی بھولے بسرے ہی آتا۔"

"تو دادی بی، ـــ بیچ میں شجو ماں نے بات کاٹی ـــ "آخر اس غریب شاہزادی کی شادی، ہوئی بھی کسی سے ــ؟"

"اے لو اور سُنو ـــ کہانی کا انجام پہلے ہی سے سُنا دیا تو کیا مزہ رہا ـــ؟ ویسے تھی نصیبوں کی پوری بیچاری۔

"ہاں تو رانی نے سوچا کہ یوں تو بات نہیں بنتی۔ ایسا کریں گے کہ ایک دن......"

اسحاق میاں نے ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اتار کے کھونٹی سے ٹانگی اور بڑی بی چچی سے بولے :-

"اجی سنتے ہو بھابی جان! وہ مدن میاں نے اپنی خلیری بہن نوری سے شادی رچالی۔"

"ہائیں ــ؟ کیا کہتے ہو میاں ـــ؟" وہ نیند میں جھپکیاں لیتی پڑی تھیں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں ـــ "ایسے کیسے ہوسکتا ہے بھلا ـــ؟"

"ہو سکنے کی بات تو جانے ہی دیجیے ـــ ہو چکا ہے!"

بڑی چچی چڑ کر بولیں :- ـــ "موئی گُن کی نہ ڈھنگ کی، کس بات پہ ریجھ گئے صاحبزادے! سارا دن تو گلی کے پوٹوں کے ساتھ ہڑبونگ مچاتی پھرتی ہے۔ لو کیسا زمانہ آ لگا ہے بچپن کی نسبت بغیر پوچھے گچھے توڑ پھینکی۔ موئی نسبت نہ ہوئی پتنگ ہوگئی۔ جب دل چاہا اتار لی۔ مگر یہ ہوا کیسے ــ؟"

"بھائی جان ـــ اب لیلی کا جوڑ تھا مل گیا۔ جو ہوا سو ہوا، مگر اب ہماری شجو ماں کا کیا ہوگا ـــ؟ اور پھر شجو ماں کی وجہ سے ربو ماں کا کیا بنے گا؟ ربو کے سسرال والے تو یوں ہی ایک ٹانگ پر کھڑے ہیں۔ جیسے تیسے اُنھیں تھاپ دے دے کر اُنھیں روکے ہوئے ہوئے تھے۔ اب تو وہ صاف کہہ دیں گے۔ ـــ نا بابا، ہم اور انتظار نہیں کر سکتے۔ ایسے کیا ہیرے جڑے ہیں تمہارے بیٹی میں، کیوں جھوٹ کہتا ہوں ــ؟"

بڑی چچی نے بڑی حسرت سے شجو میاں کی طرف دیکھا۔ جو بدنصیب شہزادی کی کہانی آنکھوں میں نمی لیے سُن رہی تھی۔

# گرتی دیوار

ابھی شجو ماں بغدادی قاعدہ ہی پڑھتی تھی کہ مدن میاں سے بات پکی ہوگئی۔ ربو، جو شجو ماں کے لگ بھگ تین برس بعد پیدا ہوئی تھی۔ ابھی بالکل ہی گڑیا جیسی تھی۔ مگر وہ بھی اپنے چچا کے بیٹے کو منگنی ہوئی تھی۔ ادھر بغدادی قاعدہ سامنے دھرا ہوتا اور ادھر شجو ماں کی مدن میاں سے نوک جھونک چلتی رہتی۔ پہاڑے یاد ہوتے رہتے اور مدن میاں سے ٹھولا ٹھالی چلتی رہتی۔ دیکھنے والے دیکھتے رہتے اور ہنس دیتے۔ بڑی چچی کہتیں :۔

"اے ہمارے وقتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اسی لئے ہنسی آتی ہے نا۔ ہمارے ماموں تو اپنی ہونے والی دلہن کو گودوں میں اُٹھائے پھرتے رہتے ہاں اور کیا! اور بھئی یہ تو ہونا ہی چاہئے میاں بی بی کی عمر میں اور کچھ نہیں تو دس برس کا فرق تو ہو۔ ورنہ یہ کیا ہے۔؟ بی بی صاحبہ کے تو دانت بھی کھل کھلے ہوگئے اور میاں ہیں کہ وہی تنی ہوئی کاٹھی اور کوے کے پروں ایسا سر لئے گھوم رہے ہیں۔ اسی سے تو نا چاقی بڑھتی ہے۔ میاں تو دیکھنے میں جوان اور بی بی بوڑھی۔ ــــ یوں نظروں سے بی بی گرے تو رنڈی کی ہنڈی تو تیار ہے ہی۔ مرد کی کاٹھی کو عورت کہاں پائے۔"

مدن میاں اور شجو ماں کا بھی اچھا خاصہ فرق تھا۔ سب کے ساتھ شجو ماں بھی اپنا بھولا بھولا منہ اُٹھا کر اُنھیں مدن بھائی کہتی، مگر کوئی نہ کوئی اسے ٹھوکا دے ہی دیتا :۔

" اری کل جبھی! بھائی پکارتی ہے ہونے والے دولہا کو۔"

اب شجو ماں کو تو یہ معلوم نہ تھا کہ دولہا کیا ہوتا ہے، مگر اتنا ضرور معلوم تھا کہ دلہے کے نام پر شرمایا جاتا ہے۔ بس وہ گٹھری سی بن جاتی۔

مدن میاں وکالت پڑھ رہے تھے، گویا بڑی انہونی بات کر رہے تھے، مگر ساس سسرے خوش تھے۔ پڑھے لکھے داماد تو ان دنوں بولتی سپاری اور ہنستی لونگ کی طرح عنقا تھے۔ اب یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے کہ شجو ماں کو تو وکیل دولہا ملے اور ربو بیچاری کو جاہل جٹ۔ گنوار کا لٹھ۔ ماں تو یہی سوچ کر نڈھال ہوئی جاتیں کہ کیسے یہ سوٹ نبھے گی۔؟ کیونکہ اور کچھ نہ سہی مگر ربو خیر سے بغدادی قاعدہ اور کلام مجید تو پڑھ ہی چکی ہے۔ دو کتابیں اردو کی۔ اور پھر دس

تک پہاڑ ے بھی — تو یاد تھے اُسے !

ادھر ننھو ماں نے سولھویں میں اور رَبّو نے تیرھویں میں قدم رکھا نہیں کہ ادھر سے رَبّو کے سسرال والوں نے اودھم مچادی ۔

" اے ہے دیکھو تو سہی ! جان جوان بیٹی یوں ہی بٹھال رکھی ہے ۔ آخر کب اُٹھانے کا ارادہ ہے ۔

پیغام تو دونوں کے موجود تھے ۔ مگر مدن میاں کی اماں کہتی تھیں ، اماں کیا کہتی تھیں، خود مدن میاں کہتے تھے کہ پہلے ایل ۔ ایل ۔ بی کی خلعت پہن لیں — پھر کریں گے شادی وادی بھی ۔ رَبّو کے سسرال والوں نے کیا کیا گھائیاں نہیں گھالیں — ؟

" اے ہم تو چھپائے ان کے گھر کی بیٹی اُٹھا کر ۔ نوج کوئی اس عمر کو ٹل جانے دے ۔ اب تو مانگ سے باندھ رکھا ہے ، پھر ڈھلتی بھی اُٹھانا ہے "

بڑی چچی نے انھیں بڑی صلاحیت سے ٹلا دیا :۔

" بات کرتے میں تین برس نکل جائیں گے ۔ پھر دیکھو دو منڈوے ساتھ ہی ساتھ پڑیں گے ۔ اَے بہن ۔ ! تم اپنی ہی والی ہو ، ذرا سوچو تو سہی ۔ چھوٹی کو وداع کر کے بڑی کو نہ اُٹھایا تو کہنے والے کیا تھو کیں گے ، میرے منہ پر کہ ہوگا بڑی میں کوئی عیب ، تبھی تو چھوٹی کو اُٹھا دیا ۔ اب اللہ سمجھے تم لوگوں سے کیا پردہ ۔ بس ایک ہی مجبوری ہے ۔ اور اتنا تو تمہیں معلوم ہے بہن کہ کرنے دھرنے والی اکیلی میں ہی میں ہوں ۔"

یہ بڑی چچی کے میاں سید رزاق بھی بڑے گنوں کے تھے ۔ اب بڑھاپے میں آکر بڑے سیدھے بن گئے ہیں — کیا کیا جلاپے انھوں نے بڑی چچی کو نہیں دیئے ؟ ۔ بس کھولتے پانی میں ڈال کر جوشش تو نہیں دیا ۔ باقی سب کھیل کھیل ڈالے ۔ ساس نندیں تو بیٹے بھائی کے کر توت سے کاہے پردہ اُٹھاتیں ۔ مگر چھوٹی نند نے بھولپن سے ایک بار کہا بھی تھا کہ :۔

" بھائی میاں نے گوری بھاوج کے چرکے بھی لگائے تھے دست پناہ سے ۔"

اب جھوٹ سچ تو اللہ ہی جانے کہ اس کمبخت کے نیچے کیا گل کھلے ہوئے تھے ۔" بات" وہی ایک بات ، عشق اور محبت کی یہ وارداتیں آج کل سے نہیں ، اس گھڑی سے چلی آرہی ہیں جب کہ آدم نے بی بی حوا کی کھوج کی تھی ، یہ رزاق میاں اپنی ماں کی گوری چٹی پکے پان جیسی اجلی بھانجی کے لئے وقف تھے ۔ اب بہن دل پر کس کا بس چلا ہے ۔؟ یہ کھیتوں پر نگرانی کے لئے جاتے تھے ۔ وہیں

جھونپڑیاں پر کلو سے کسان کی لونڈیا سے آنکھ لڑگئی۔ ان کا تو کیا گیا، برس پیچھے وہ ضرور ایک حرامی پلے کی ماں بن گئی۔ اس کو تھاپ پر تھاپ دیئے جاتے تھے کہ بس شادی کروں گا تو تجھی سے، ورنہ زہر کھا لوں گا۔ اس بیچاری کو تو یوں ہی برادری والوں نے نکال باہر کیا تھا۔ کرتی بھی کیا۔

"اب ادھر ماں باپ نے شادی کی بات اٹھائی۔ پہلے والے تو اپنی بات کے پورے ہوتے تھے۔ رزاق میاں کی ایک نہ چلی۔ باپ نے یہ کہہ کر منہ بند کر دیا کہ" اسلام میں چار چار جائز ہیں۔ ارے میاں بہت ہوا تو اس سے نکاح پڑھوا لینا"۔

مگر کھلے بندوں چھٹی تو انھوں نے بھی نہ دی۔ سید تھے۔ بات کیسے گرنے دیتے ـــ؟

بڑی چچی بیاہ کر بھی آگئیں، مگر میاں کے تیور وہی رہے۔ اب بھی لپ چھپ کر جھونپڑیا پر جاتے۔ مگر مارے باندھے کے چار چھ بچے بڑی چچی سے بھی ہو گئے۔ یہ بیچاری بڑی صابر تھیں۔ کبھی منہ سے نہ پھوٹتیں۔ جو جو پڑی وہ جھیل گئیں۔ کبھی بھولے بسرے ایک حرف شکایت کا زبان پر لاتیں بھی تو سننے والیاں یوں اچھالتیں۔

"اے واہ، یہ اچھی سنائی بوا۔ کیا محبت نہیں، پیار پیرت نہیں تو پھر یہ بچے کیسے ہوتے"، بڑی چچی ایک بار تو جل کر بول گئیں:۔" اے بچوں کا نہ کہو۔ بچے تو کتے بلیوں کے بھی ہو جاتے ہیں، ہمارا کیا ہے ـــ؟"

پورے سسرال میں وہ تھڑی تھڑی ہوئی کہ بڑی دلہن نے تو اپنے بچوں کو کتے بلیوں کے مقابل بٹھا دیا۔ ایمان کی بات تو یہ تھی کہ کتے بلیوں کی بھی تو اپنی مرضی ہوتی ہوگی۔ یہاں تو یہ حال تھا دادا حضرت زبردستی اندر بھیج کر باہر سے کنڈی چڑھا دیتے اور مارے باندھے کے جوں توں رزاق میاں کو رات بی بی کے ساتھ بسر کرنی ہی پڑتی۔ مگر سورج شام کو تو ڈھلتا ہی ہے۔ دن بھر کتنا جگمگالے۔ اب تو رزاق میاں راستے پر آگئے تھے۔ جھونپڑیا والی سے بھی پیچھے اور پر تین تین بچے ہوئے مگر چچوڑی ہوئی ہڈی کو کون دسترخوان کی زینت بنا لیتا ہے ـــ؟ دودھ جیسا بے داغ اور سنگ مرمر ایسا پتھر یلا اور سفید جسم جب تک ساتھ دے گیا۔ ـــــ دے گیا۔ پھر وہ آپ ہی آپ دل سے نظروں سے اتر گئی۔ گاؤں کے حاکم تھے، کس کی مت ماری گئی تھی کہ فضول پرچول کرتا پھرتا۔

یوں تو رلو کے سسرال والے اُس گھڑی مان گئے۔ مگر اُدھر بدن میاں نے وہ ترقی پسندی دکھائی کہ بڑی چچی کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اب تو کوئی ٹھور ٹھکان بھی نہ تھا۔ منگی ہوئی لڑکی کا پیغام ٹوٹ جانا یہاں تو ایسا سمجھا جاتا کہ حرام کا پلہ جننے والی اس سے اونچی تھی۔ لوگ باگ یہی

تو پوچھتے کہ آخر ایسی کون سی خرابی تھی کہ ٹھیکرے کی مانگ ٹوٹ گئی ۔؟ پھر وہ غیر کفو والے ہی بیاہ لے جائیں، ـــ بیاہ لے جائیں ۔ اپنے والے تو بھول کے بھی نہ کرتے ۔ بلکہ موقع ملے تو اور پردے اُٹھاتے ۔ اور یہاں تو سوال بڑی بیٹی کا آپڑا تھا ۔ ربو ہوتی تو ایک بات بھی تھی، وہ پھر بھی چھوٹی تھی ۔ پہلے تو شجو ماں یوں ہی بڑی اور اس پر سے پیام بھی جاتا رہا ۔ بڑی چچی تو حواسوں ہوتے بھی پاگل ہو کر رہ گئیں ۔ بلو پیار لپسار کے مدن میاں کی کڑیل جوانی کو کوسنے دیتیں ۔ پھر آجا کے نوری پر صلواتیں پڑتیں

" اے بی ہمیں سب معلوم ہے ۔ آج کل مواایسی چلن ہو گیا ہے ۔ کھلے بندوں، چڑھاوے کے بیلوں کی طرح جوان ہیلاٹ لڑکیاں چھوڑ دیتے ہیں ۔ آپ ہی لڑکوں کی نگاہ پڑے گی اور من مانی کریں گے ۔ کیا ہم نے دیکھا نہیں اتنی بڑی سنڈی کی سنڈی آنگن بیچ کدکڑے لگاتی پھرتی ہیں ۔ اب میں کہوں خالہ کا چھوکرا ہوا تو کیا غضب ہو گیا، ہے تو نامحرم ۔ معلوم ہے جی، یہ سب چال پہلے ہی چلی ہوئی تھی ـــ ۔"

اب یہ تو اوپر والے کو ہی معلوم تھا کہ چال واقعی چلی ہوئی تھی یا اچانک ہی وہ سیاہ تل شجو ماں کی تقدیر کی سیاہی بن کر ان کے وجود کو کھا گیا! مگر کوسنوں سے ہونا بھی کیا تھا ۔؟ چڑا تو ہاتھ سے اُڑ گیا تھا ـــ !

" کاگا رے کاگا ـــ تیرے پیروں باندھوں سونے کا دھاگا

میرے بھاگوں کوئی مہمان آتا ہو تو ـــ تو ـــ اُڑ جا

" ہائے بیچاری شہزادی، روزانہ محل کے چھجے پہ کھڑی ہو کر یہ آواز لگاتی ۔ سیکڑوں کوے منڈیر پر میٹھے کے بیٹھے ہی رہتے، کوئی بھی تو نہ اُڑتا ۔"

" ہائے ۔ تو دادی بی ایسا کہنے سے کیا ہوتا ہو گا بھلا ـــ ؟"

یہ ربو بیچ میں دادی بی کو ٹوک ٹوک دیتی تھی ۔

" پھر بھلے لگ دیا نا! اری کلموہی، کوے کو پکار کر، اس کے پیروں سونے کے دھاگے باندھنے کا لالچ دے کر اس سے پوچھو، میرے گھر کوئی مہمان آنے والا ہے ـــ ؟ اگر اُڑ جائے تو سمجھو بالم کو سندیسہ پہنچانے اڑ گیا، اور بیٹھا ہی رہے تو سمجھو بالم ٹالم کوئی ہے ہی نہیں ۔ اُڑے بھی تو سندیسہ کیسے دے؟ ہاں، اب سے بیچ میں نہیں بولنا ۔ تو بس بیچاری شہزادی کھڑے کھڑے تھک جاتی، مگر اس کے نصیب کھلنے تھے نہ کھلے ۔ اور بیچاری کو شہر ممنوع میں جانے کی اجازت کبھی نہ ملی ۔ اللہ کا نام بڑا، اس

کا کام بڑا ـــ ایک دن ـــ"

"یہ شہرِ ممنوع کیا ہوتا دادی بی ـــ ؟" شجو ماں نے بہت ہی سادگی سے سوال کیا۔

دادی بی نے یوں ٹوکے جانے پر گھور کر دیکھا، مگر چونکہ شجو ماں بہت کم کوئی سوال کرتی تھی، اس لئے پیار سے بولیں :ـــ

"اے تم یں سمجھ بھی کیا! بادشاہ کی مملکت میں ایک بڑا سا باغ نما شہر ہوتا تھا، بڑا رنگ برنگا۔ وہاں صرف وہی لوگ جا سکتے تھے، جن کی شادیاں ہو چکی ہوں۔ اور پھر وہ جوڑے وہاں ایک رات گزار کر واپس آجاتے تھے۔ اور پھر وہ شہر ان کے لئے شہرِ ممنوع نہ رہ جاتا تھا۔"

"تو دادی بی وہاں کنواری لڑکیاں نہ جا سکتی ہوں گی ؟"

"لو اور سنو! وہاں بھلا کنواریوں کا کام؟ شہرِ ممنوع جو نام پڑا تو تم ایسی کنواریوں کی وجہ سے ہی پڑا۔ کھلی بستی ہوتی تو کیا بیاہی، کیا ان بیاہی، سبھی دھول اڑاتی پھرتیں، مگر وہ تو شہرِ ممنوع تھا۔

"توبہ ہے، بیچ بیچ میں سو رخنے پڑ جاتے ہیں۔ ہاں تو اللہ کا کرنا ہوا یہ کہ ......"

اسحاق میاں ہمیشہ کلائیکس کے لگ بھگ پہنچ کر ایک آدھ زوردار ہوائی چھوڑ دیا کرتے تھے۔ ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اتار کر کھونٹی سے ٹانگی اور بولے :ـــ

"اجی سنتی ہو بھابی جان! وہ جمو میاں کے ابا ملے تھے۔ ربو کی شادی کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ یہ بھی صاف صاف سنا دیا کہ اگر جلد ہی شادی نہ کی تو سمجھو پیام ٹوٹا ہوا ہے"

"ہائیں!"، بڑی چچی جھپکیاں سی لے رہی تھیں، ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

"ایسے کیسے ہو سکتا ہے بھلا ـــ ؟"

"ہو سکنے کی بات جانے دو، اور جو ہو گیا تو سر پکڑ کر جھینکتی رہنا۔ میں کہتا ہوں کر ہی دو نا ربو کے ہاتھ پیلے۔ اب اس بیچاری کے نصیب تو دغا دے گئے۔ تم ہی سوچو ـــ ایک تو یوں ہی بیٹھی ہی ہے۔ دوسری بھی چھاتی پر مونگ دلے گی۔ کیوں جھوٹ کہتا ہوں میں ـــ !

"نا میاں ـــ تم جھوٹ کاہے کو کہو گے! مگر یہ تو سوچو شجو ماں بڑی ہے۔ آنکھوں ہوتے دیکھے گی کہ چھوٹی گھر بار برت رہی ہے۔ بیچے جھلا رہی ہے تو اس کے دل پر کیا بیتے گی ؟"

"بھابی جان اتنا تو میں بھی سمجھتا ہوں، مگر تم گہرائی میں تو جھانکو۔ ایک کے ساتھ دوسری کی بھی زندگی تباہ کرنا کہاں کی ایسی دانشمندی ہے۔ اس کے نصیبوں کا بھی کوئی بلخ کا شہزادہ آہی

جائے گا۔ ہم ایک گنا فکر کرتے ہیں تو اوپر والا ہزار گنا کرتا ہے۔ ہاں آگے تم سمجھو۔ اور یہ بھی نہ ہوا تو بیٹھی رہے گی تمہارے کولہے سے لگ کر ——— تنکر میں دب کر کوڑا مر نہیں جاتا۔"

"سمجھتے تو ٹھیک ہو میاں۔ ابھی تو اللہ ہی جانے اور کیا کیا دیکھنا اور سننا پڑے۔ کنواری بیٹی اور پہاڑ کو تو لو، پھر بھی پہاڑ ہی اوپر اوپر اٹھتا چلا جائے۔ یہ پلڑا بڑا بھاری ہوتا ہے میاں۔"

## اندھیرا

بچپن سے شجو ماں یہی سنتی آئی تھی کہ دو منڈوے ساتھ ساتھ پڑیں گے، ساتھ ہی ساتھ ہلدی چڑھے گی، مہندی لگے گی اور دونوں ساتھ ساتھ ڈولی میں چڑھیں گی۔ یہاں تو بیچ میں ہی ڈور کٹ کے رہ گئی۔ کان تو شجو ماں کے بھی تھے۔ بڑے ٹھنڈے دلوں سنا کہ ربو کی شادی ہو رہی ہے۔ جس کا ابھی صرف سولہواں ہی تھا اور یہاں شجو ماں تو اٹھارواں بھی پھلانگنے کی سوچ رہی تھی۔

سر جھکائے جھکائے شجو ماں نے ربو کی کرتی میں چکنے کا سرا لگایا اور ٹپ سے دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کی گود میں گر پڑے۔ وہ تو اچھا ہوا کسی نے یہ جگنو چمکتے دیکھے نہیں، ورنہ کہنے والوں کے منہ تو بند نہیں ہیں۔ کچھ بھی اڑ جاتی۔

"اوئی بہن کا سکھ دیکھا نہیں جاتا"

"منہ زور جوانی ہے، سنبھالی نہیں جا رہی ہوگی۔"

وہ تو پہلا تیر تھا جو اس کے دل کو چھید گیا۔ اب تو یہاں دن رات دھڑا دھڑ بھولیاں سل رہی ہیں۔ اس پہ بانکڑی ٹنک رہی ہے۔ کھڑے دوپٹے چنے جا رہے ہیں اور کرن ٹنک رہی ہے۔ کرتے قطع کئے جا رہے ہیں اور گلے مونڈھے ٹنک رہے ہیں اور ان سب کاموں میں شجو ماں آگے آگے ہے۔ ربو تو دن رات پلنگ توڑتی یا پھر سکھی سہیلیوں سے کھسر پھسر کرتی رہتی۔ سارا کام شجو ماں کے سر تھا۔ گھڑکیاں بھی سُن رہی ہے۔ جابے جا پڑ تال بھی پڑ رہی ہے۔

"اے ہے شجو ماں! یہ دیکھو مونڈھے کے پاس سے لہر ٹیڑھی ٹانک دی۔"

"اے بی تمہیں آنکھیں نہیں ——؟ یہ بانکڑی میں نے تمہیں کرتی پر لگانے کے لئے دی تھی ——۔"

سر سر دن گزرے جا رہے تھے۔ جیسے پروائی کے جھونکے۔ دیکھتے دیکھتے شادی کا بھی دن آگیا۔ شجو ماں نے اپنے ہاتھوں دلہا میاں کی سلامی کی تھالی سجائی۔ ادھر ربو دلہن بنی

بیٹھی تھی اور آج کئی دنوں بعد پھر شجو ماں کی آنکھیں برسے جا رہی تھیں۔ کون جانے یہ آنسو بہن کی جدائی پر تھے یا اپنی بدنصیبی پر!

مہمان بیبیاں اُترتیں۔ جان بوجھ کر بڑی چچی کے پاس رکتیں اور پوچھتیں:۔

"اوئی بہن، ہم تو سدا سے سنتے آ رہے تھے کہ دو منڈوے پڑیں گے — ہوا کیا —؟"

"اے بہن، یہی وہ تمہاری بیٹی ہے جس کا ناطہ ٹوٹ گیا۔"

بڑی چچی چونّی بنی اِدھر اُدھر منہ چھپاتیں۔ بہانوں سے منہ پھیر پھیر کے آنکھیں پونچھتیں۔ اور ادھر شجو ماں پھرکی بنی سارا کام نبٹا رہی تھی۔ ہر احساس سے عاری۔ ابھی جہیز کے کمرے میں ساڑیاں لائن سے جما رہی تھی تو ابھی باورچی خانے میں کھانے دانے کی خبر لینے جا پہنچی۔ ابھی پھلواری سے سہرے کے لئے پھول لے رہی ہے تو ابھی عود دان میں انگارے لیے ربو کے بال سکھاتے لپک رہی ہے۔

شجو ماں کی نیند سے آنکھ کھلی تو کب کھلی، جب میراسن نے ڈھولک پر تھاپ دی۔

"تاروں میں جلوہ دوست بابا، جلدی گھر کو جانے دو۔"

سلامی کی تھالی لئے وہ بے حجیر چلی جا رہی تھی۔ اک دم اس کے قدم ٹھٹھک گئے۔ ساتھ کی سکھی سہیلیاں سب ربو کی جان پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں۔ جہاں آرا، جس کی شادی کو سال بھر ہو گیا تھا اور اب تو گود بھی بھری پڑی تھی، ربو کو ٹہیل رہی تھی:۔

"اری سنتی ہے — جلوے میں اتنی بھی دیر نہ ہو۔ اُدھر بنے میاں انتظار جو فرما رہے ہیں۔"

ربو گٹھری تو تھی رہی، اور بھی سمٹ گئی۔

"اری یہ سب چالیں ہیں۔" کوئی دوسری بولی، — "ہم سب سمجھتے ہیں۔ دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے کہ کب جائے اور کب دولہے میاں کو اپنے ہاتھوں پان بنا کر کھلائے —"

شجو ماں کے قدم سو سو من کے ہو گئے۔

"تجھے قسم ہے ربو جو دو گھنٹے خوشامد نہ کروائی ہو۔"

"ارے یہ رات ایک ہی بار تو آتی ہے۔"

چھن چھن ..... چھن ..... چھن ..... تھالی گر گئی اور سلامی روپے پیسے کے پورے، مع چکنی، الائچی، لونگ کے برآمدے میں بکھر گئے۔

پھر شجو ماں کو معلوم نہ ہو سکا کہ کب ربو کی رخصتی ہوئی۔ واقعی تاروں کی چھاؤں میں ہوئی یا ابھرتے تاروں میں ہو کر وہ جلد ہی خوشامد کر واتے چلی گئی۔ مگر جب شجو ماں کو ہوش آیا تو اس کی آنکھوں تلے سیاہ سیاہ گھیرے تھے۔ دل چلتے میں رہ رہ کے زور زور سے دھڑک اٹھتا، چکر آتے تھے۔ اور ادھر ربو تھی کہ شادی کو ڈیڑھ دو ماہ بھی نہ ہوئے تھے۔ جماگیاں بھی پوری نہ ہوئی تھی، شرم بھی نہ ٹوٹی تھی ساس نندوں سے کہہ گھونگٹ کا پردہ اٹھا اٹھا کر وہ ابکائیاں لینے اور قے کرنے لگی۔

ربو کے میاں شہر میں کوئی کاروبار کرتے تھے۔ ہفتہ میں چار دن باہر گزارتے چار دن گھر پہ رہتے۔ داماد آتے تو شجو ماں ہی ان کا کمرہ سلیقے سے سجاتی۔ لاکھ صفائی، جھاڑ جھٹکی کرتی، مگر ربو صبح اٹھتی تو وہی مچھروں کا رونا لے کر گال سہلاتی ہوئی، زیرِ لب مسکراتی ہوئی۔

"اپی جان، غضب ہے اللہ کا! یہ مچھر کاہے سے ٹوٹے پڑے ہیں"

سلیمن ایک دن دیدے مٹکا کر بولی:—

"ہاں شجو بی بی، سچ مچ یہ مچھر۔ توبہ ہے! اتنا بڑا مچھر ہے، ایک دو نہیں پورے بتیس دانت ہیں اس کے منہ میں۔ اور کمبخت جب ڈنک لگائے گا تو چہرے پر۔ گالوں پہ ہونٹوں پر، کیوں ہے نا ربو بی بی —؟"

ربو بی بی مسکرا کر اور بن کر شرماتی ہوئی اسے مارنے کو لپکیں اور شجو ماں کی آنکھوں میں رات کی بھرپور سیاہیاں تیر تیر گئیں۔

"شجو ماں کو کب تک یوں ہی بٹھائے رکھو گی —؟ کہیں کر ڈالو نا بہن"

"اللہ رکھے چھوٹی تو جھولا جھلانے کو ہو رہی ہے اور بڑی ابھی تک بیٹھی ہی ہے"

آنے جانے والیاں جان بوجھ کر، جان جان کر، سوئیاں سی چبھوتیں اور بڑی چچی کا منہ نہ اٹھتا کہ ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکیں۔

"سلیمن، توبہ ہے! اتنی شکر کیوں بھر دی حلوے میں —؟ دیکھتی نہیں ربو کو ابکائی پر ابکائی چلی آ رہی ہے"

"اجی بی بی، یہ ابکائی پھیکا کھانے سے نہیں رکنے والی۔ ہماری بی بی اللہ رکھے گود ہری ہونے والی ہے" سلیمن ہاتھ چلا چلا کر بولنے لگی۔

شجو ماں اپنی بڑی آنکھوں میں حیرت لئے کبھی ربو کا منہ دیکھتی تو کبھی سلیمن کا۔ دوسرا

قدم جو اس کا اٹھا تو وہ مشین پر جا بیٹھی۔ دبلے پتلے کانپتے ہاتھوں سے اس نے پھول دار گلابی ریشم اٹھایا اور چھوٹے چھوٹے کرتے قطع کرنے لگی۔

# بڑھاپا

بلی اور وقت چلتے ہیں تو پاؤں کی آواز نہیں پیدا ہوتی، مگر چلنے دلوں ہی میں۔ وقت دبے پاؤں گزرتا چلا گیا، بالکل دبے پاؤں۔ بلی کتنی ہی اونچائی سے گرے، پنجوں کے بل گرتی ہے۔ آواز نہیں پیدا ہوتی۔ وقت اور زمانے کے کوڑے بھی دل پر کیسے ہی برسیں، آواز نہیں پیدا ہوتی۔ ہاں آنکھیں ضرور دھندلا جاتی ہیں اور بالوں پر راکھ جم جاتی ہے۔

باورچی خانے سے شجو ماں نکلی تو سلیمن بولی:-

"بی بی! سر تو جھاڑ لیجیے، راکھ جم گئی ہے۔" شجو ماں کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ مگر یہ آخری تیر تھا۔ چپکے سے یوں ہی شجو ماں نے آئینہ تھاما تو کئی زمانے اس کی آنکھوں کے آگے سے گزرتے چلے گئے ــــ گزرتے چلے گئے ــــ گزرتے چلے گئے اور اپنے نظر نہ آنے والے قدموں کی سفید سفید سی دھول چھوڑ گئے جو اور کوئی مناسب مقام نہ پا کر شجو ماں کے سر پر جم گئی۔

وقت گزرتا ہے تو اپنے ساتھ وہ ولولے اور آرزوئیں بھی لئے جاتا ہے۔ جن سے دل کی بستی آباد ہوتی ہے۔ مگر شجو ماں کا دل کیسا نگر تھا کہ کبھی تو ویران نہ ہوا۔ آگے سے، پچھواڑے سے، جہاں موقع ملتا وہ گھر کے چھجے پر چڑھ جاتی اور گھگھیا گھگھیا کر ایک ایک کوے سے مخاطب ہوتی۔

"سکا گا رے کا گا تیرے پیروں باندھوں سونے کا دھاگا
میرے بھاگوں کوئی مہمان ہو تو تو اڑ جا۔"

مگر سونے کی پائل کا لالچ بھی انھیں نہ رجھاتا۔ مزے سے بیٹھے کائیں کائیں کئے جاتے۔ کوئی تو ایسا نہ تھا جو اڑ کر بالم کا سندیسہ لاتا اور اس شہر ممنوع کے دروازے اس کے لئے کھل جاتے۔

"ہا ــــ بچاری ــــ دادی بی کی شہزادی کو اب تک بھی شہزادہ نہ ملا تھا۔ وہ اپنی مخصوص ادا سے اب بھی پان چباتے ہوئے ــــ ہائے ــــ بچاری شہزادی ــــ" کہہ کر پھر سے کہانی

شروع کر دیتیں۔

کبھی کبھی شبو ماں محسوس کرتی کہ اس کہانی کی شہزادی اور کوئی نہیں، وہ خود ہے۔ جسے کبھی شہزادہ نہیں ملا — نہیں ملے گا۔ دل میں ڈر لئے کبھی کبھی وہ چاہتی کہ اس کہانی کا انجام پوچھ لے۔ "دادی بی! پھر اس شہزادی کے لئے شہر ممنوع کے دروازے کھلے — ؟" مگر یہاں پہنچ کر وہ آس بھی دھواں بن کے اڑ جاتی تھی جس کے سہارے وہ جی رہی تھی۔ شبو ماں کے منہ کا تالا کبھی تو نہ کھل سکا۔

"ہا — بیچاری شہزادی — دیکھتے ہی دیکھتے زمانہ گزرا — اور ایسا گزرا کہ شہزادی کے بالوں پر برف سی پڑ گئی۔"

شبو ماں نے گھبرا کر اپنا مرجھائے پھول ایسا چہرہ پاندان میں لگے آئینے میں دیکھا۔

"دادی بی —" وہ چلا اٹھی — "کوئی دوسری کہانی سناؤ — دوسری کہانی سناؤ — دادی بی یہ کہانی تو برسوں سے ادھوری ہے۔ شہزادی کو شہزادہ نہیں ملے گا۔ کبھی نہیں ملے گا — مجھے معلوم ہے — مجھے سب کچھ معلوم ہے دادی بی —"

اور وہ تکیہ میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

## سہارا

بچپن میں شبو ماں نے بغدادی قاعدہ پڑھا تھا، پھر اردو کی چار چھ کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ماموں، چچا سے پہلے تو رفت، رفتن کی گردان پڑھی، پھر شیخ سعدی کی "گلستاں" "بوستان" بھی پڑھ ڈالیں۔ ماں نے منع بھی نہ کیا، کیونکہ معلوم تھا کہ ہونے والے دولہے میاں بھی پڑھ رہے ہیں۔ دو سے شروع کیا اور بیس تک پہاڑے بھی رٹ ڈالے۔ مگر یہ کیا معلوم تھا کہ تختہ ہی الٹ جائے گا اور پڑھا لکھا سب خاک میں مل جائے گا۔ اب گھر میں بیٹھے بیٹھے کوئی کام تو تھا نہیں، اسحاق چچا کی بیٹیوں کو الف، بے کی تختی یاد کروانی شروع کر دی۔ اسحاق چچا کی بیٹیوں کے ساتھ کھیلنے والیاں بھی تھیں، وہ بھی پاس آ کر بیٹھنے لگیں۔ پھر ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ شبو ماں کی اچھی خاصی جماعت جڑ گئی۔ دس برس کے اندر کے لڑکے بھی آنے لگے اور یوں اِدھر اُدھر کے ملا کے بیس پچیس بچّے ہو گئے اور شبو ماں باقاعدہ "آپا جی" بن گئیں۔ بڑے پیار سے وہ ہر ایک کو بغیر گھر کے

مجھ کے پڑھاتی۔ دل تو سدا کا بھوڑا نھا دکھتا ہوا۔ جس کا دل دکھا ہوگا وہ کسی کو کیا کچھ کہے گا! سارے بچے ایسے ہل مِل گئے گویا آپا جی سے برسوں کی جان پہچان ہو۔ پڑھانے کا وقت صبح دس بجے سے پانچ بجے تک تھا۔ مگر اِدھر صبح ہوئی نہیں کہ اکدم دو دو تین تین بچوں کی ٹکڑیاں آنی شروع ہوجاتیں اور سب آ آکے دیوان خانے میں بیٹھتے جاتے۔ اور شام کو پانچ تو کیا سات آٹھ بھی بج جاتے تو بچے جانے کا نام نہ لیتے۔ اتنے دل جمعی سے پڑھنے لگے اور گھروں کو بھجواتے وقت اتنے ڈھیٹ بن جاتے کہ شجو ماں کو مجبوراً رات کو بھی پڑھانا پڑا۔ جس میں دادی بی کی کہانی بھی شامل ہوتی۔

اتنی مصروفیت میں بھی شجو ماں کو کوئی خیال ایسا بھی تھا کہ کبھی بھلائے نہ بھولتا۔ اور یوں جیسے وہ بھی نماز روزے کی طرح زندگی کا ایک اہم فریضہ ہو، آپ ہی آپ وہ چھجے پر جا کھڑی ہوتی اور ہولے ہولے پکارتی :۔

" کاگا رے کاگا تیرے پیروں باندھوں سونے کا دھاگا "

کوے دھوم مچاتے :۔ کائیں، کائیں، کائیں ــــ مگر وہیں بیٹھے رہتے۔ بالم کا سندیسہ کبھی نہ آیا اور اب تو شجو ماں کی آنکھیں بھی روتے روتے دھندلا گئی تھیں۔ ایک طرف آنسو تھے، ایک طرف انتظار ــــ کس کا انتظار؟ یہ تو اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ بس روکے جاتی اور پکارے جاتی :۔

" تو ــــ تو اُڑ جا ــ کاگا رے کاگا ــــ "

مگر کوؤں کو چھجے کی منڈیر ایسی بھائی تھی کہ اُڑنا تو دور رہا پَر بھی نہ پھٹ پھٹاتے۔

" ہا ــــ بیچاری شہزادی ــــ! بڑی کرموں جلی تھی بیچاری۔ راجہ رانی کی تو کبھی بنی نہیں۔ ارے جس کے سر پر باپ کا سایہ ہو اُسے کاہے کا ڈر ــــ؟ یہ چھتر چھاؤں تو ایسی ہوتی ہے کہ ساری بلائیں اپنے سر لے۔ مگر راجہ تو بس اپنی ہی جگہ مست تھے انھیں کیا فکر! بیچاری باپ کے ہوتے بھی یتیم ہی تھی ــ "

" وہ کیوں دادی بی ــ؟ "، جماعت کی کوئی معصوم سی بچی پوچھ بیٹھتی۔

دادی بھی گھورتیں ــ "پھر ٹوکا دیا نہ مجھے ــ؟ ارے راجہ کی پسند کی رانی کہاں تھی؟ بس تبھی سے یہ کھوٹ چلی آتی تھی۔ پھر دادی بی اس خیال سے بیگانہ کہ سامعین ننھے منے بچے ہیں بکے چلی جاتیں :۔

"اور کھوٹ بھی ایسی ویسی تھی! ارے الٹے سیدھے دو چار بچے ہی کیسے ہو گئے، سو ہو گئے، ورنہ اب تو یہ حال تھا کہ راجہ جی اپنی رانی سے باقاعدہ ماں بہنوں جیسا برتاؤ رکھتے ہاتھ تک نہ لگاتے۔ ارے بازو تک نہ بیٹھتے، تو بچوں کچوں کا کیا سوال۔۔ ؟ مزید ثبوت کو وہ سب کی طرف گردن گھما گھما کر دیکھتیں اور بولتیں: ۔

"ارے پاس آ کے بیٹھیں گے ہی نہیں تو پھر اولاد کیسے پیدا ہو بھئی۔ ہاں تو پھر یہ دوری اتنی بڑھی ۔۔۔ اتنی بڑھی کہ راجہ باہر کے ہو کر رہ گئے اور رانی اندر کی۔ اب ماں کو جتنا درد بیٹی کا تھا اتنا باپ کو کہاں تھا ۔۔ ؟ ماں گھلتی رہتی مگر فکر دور نہ ہوتی۔

"ہاں، تو پچھلی بار میں نے کہاں تک کہی تھی کہانی ۔۔۔ ؟

"ہاں، تو اللہ کا نام بڑا، اس کا کام بھی بڑا۔ ایک دن اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ ایک مصیبت کا مارا کوئی شہزادہ، شہزادی کے محل تک آنکلا ۔"

ننھو ماں ربو کی چوتھی بیٹی کے لئے ان کے موزے بُن رہی تھی، اکدم چونک پڑی۔ سلائیاں اور ان کا گولا اس کے ہاتھ سے چھٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اس کا منہ مارے حیرت کے کھلا رہ گیا تھا۔ کیا شہر ممنوع کے دروازے اس کے لئے ۔۔۔۔ شہزادی کے لئے کھل سکتے ہیں ۔۔ ؟

"تو دربان نے آ کے اطلاع دی کہ کوئی شہزادہ مصیبت کا مارا آیا کھڑا ہے اور شہزادی کی خدمت میں باریابی چاہتا ہے۔ شہزادی نے اسے خاص اپنے حرم میں بلوایا۔"

اور اس نے شہزادے سے پردہ نہیں کیا ۔۔ ؟" عائشہ بول اٹھی جواب دسویں میں تھی۔ اور اسے بار بار سینے پر دوپٹہ رکھنے کی تاکید اور گلی میں نکلنے کی ممانعت کی جاتی تھی۔

"اے تو بی بی اب شہزادی خود جو اتنی سمجھدار تھی، بھلا اسے پردے جھردے کی کیا ضرورت؟ ہاں تو بھئی شہزادی نے شہزادے کو بلا ہی لیا، اگر شہزادی کو یقین نہ ہوا کہ یہ شہزادہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے بدن پر بڑے بڑے کپڑے تھے اور سفر سے اس کی صورت بھی بڑی ہونق ہو گئی تھی۔ بال بھی بڑھ گئے تھے۔ شہزادہ تو کیا، ہاں ۔۔ ! صورت سے قیدی ضرور لگتا تھا۔"

دادی بی نے خود ہی زور کا قہقہہ لگایا اور سب کی طرف دیکھا۔ بچے بھی ہنسنے لگے، مگر ننھو ماں منہ کھولے کہانی کے آگے بڑھنے کا انتظار کرتی رہی۔

"اب تم جانو شہزادی شہزادی سو عقلمندوں کی ایک عقلمند۔ اس نے سوچا: ۔ اونہہ ۔ ایسے نہیں۔ اس کا امتحان لیا جائے کہ واقعی یہ شہزادہ ہے۔ بس تو شہزادی نے

نوکروں کو حکم دیا کہ راتاراتی کپڑا خرید لائیں ـــــ ہر ہر قسم کا کپڑا، اور اس کے گدے تیار کریں۔ بس پھر نوکر خریدی کے لئے دوڑے۔ پورے شہروں میں ستر رنگوں کا کپڑا ملا۔ جھٹ پٹ اس کے گدے تیار کئے گئے۔ شہزادے کو نہلا دھلا کر کپڑے بدلوائے گئے اور پھر شہزادی نے بطور خاص یہ اہتمام کیا کہ اپنے ہاتھوں بستر لگوایا ـــــ معلوم ہے کیسا بستر ـــ ؟"

دادی بی کی کہانیوں میں دل بھر کے ناقابلِ یقین باتیں ہوتی تھیں۔ پھر بھی سب بڑے چاؤ سے سُنتے۔

"ہاں تو بستر کیسا تھا ـــ ؟ معلوم ہے شہزادی نے ایک کے اوپر دوسرا، دوسرے پہ تیسرا ـــ تیسرے پہ چوتھا ـــ ایسے ستر گدے ایک پر ایک رکھوا دیئے اور ان کے نیچے چنے کا ایک دانہ الٹا کر کے رکھ دیا۔"

"چنے کا دانہ وہ کیوں ـــ ؟" چھجو حیرت سے بولا۔

"ارے آگے سنو نا۔ بیچ بیچ میں منہ کیوں مارتے ہو رے ـــ ؟ تو بھئی شہزادی نے چنے کا دانہ ستر گدوں کے نیچے رکھ دیا۔ رات ہوئی، سب سو گئے۔ صبح ہوئی، شہزادی نے منہ ہاتھ دھویا نہ کپڑے بدلے اور شہزادے کی خبر لینے اس کے کمرے میں جا پہنچی۔ پوچھا:-

"کیوں جی، آپ کی رات کیسے گزری ـ"

شہزادے نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"جی رات تو آپ کی بدولت اچھی ہی گزری، ـــ مگر ....." اور اتنا کہہ کر وہ رک گیا۔

"کیا ـــ ؟" شہزادی نے پوچھا۔

"مگر کوئی چیز رات بھر میری پیٹھ میں چبھتی رہی ہے اور میں سمجھتا ہوں اس کی وجہ سے میری پیٹھ میں نیل بھی پڑ گیا ہوگا۔"

شہزادی نے اس کی قمیص الٹ کر دیکھی تو واقعی پیٹھ نیلی ہو رہی تھی تب شہزادی کو یقین آگیا کہ واقعی یہ سچا شہزادہ ہے۔ کیونکہ شہزادے اور شہزادیاں ہی اتنے نازک مزاج ہو سکتے ہیں کہ ستر گدوں کے نیچے سے بھی ایک چنا ان کے نیل ڈال دے۔

جب شہزادی کو پتہ چل گیا کہ یہ سچ مچ کا ہی شہزادہ ہے اور اس نے جھوٹ موٹ نہیں کہا تھا تو شہزادی کے دل میں شہزادے کی محبت پیدا ہو گئی۔ شہزادی خود اچھی عمر کی تھی اور

شہزادہ بھی خاصی بڑی عمر کا تھا۔ تو تم جانو دھان کا پودا گھٹنے گھٹنے پانی ہی میں پروان چڑھتا ہے۔ ادھر شہزادی نے یہ چلن اُٹھار کھا تھا کہ چوڑیاں، زیور اور رنگ برنگی کپڑے دھڑے پہننا سب ترک کر دیا تھا۔ گویا بیوگی اُٹھالی تھی۔ اب تو اس نے رنگ برنگی، جھکا جھول کپڑے پہنے، چم چماتی، کھنکھناتی چوڑیاں پہنیں، جھومر لگایا۔ شہزادے نے بھی یہ سب کچھ دیکھا اور اس وقت تو بڑا مزا آیا جب......"

اسحاق میاں نے ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اتار کر کھونٹی سے ٹانگی اور بہت تیز لہجے میں بولے :۔

"اجی بھابی جان سنتی ہو! غیر کریں تو پھر غیر ہیں۔ یہ تو اپنے والے ہیں نا۔ کیا کیا اڑانے پھر رہے ہیں۔ سالے کہتے ہیں......" ایکدم وہ رک سے گئے۔

"کیا کہتے ہیں ۔۔ ؟" بڑی چچی نے ہولا کر پوچھا۔

دیوان خانے میں کرسی پہ بیٹھی شجوماں انھیں کی طرف دیکھ رہی تھی، آواز نیچی کر کے بولے:۔

"کہتے ہیں ربوسدا اپنے میکے رہتی ہے اور وہاں اس کے میاں کا بھی آنا جانا ہے۔"

اور وہ معنی تیز انداز میں خاموش رہ گئے۔

"اور وہ تمہاری میری بہن ۔۔" وہ پھر بول اُٹھے۔ "کمینی کدھر کی، کہتی تھی شجوماں کی آنکھوں میں یہ حلقے کیسے پڑے ہیں۔ ؟ اور کھانا تو برائے نام کھاتی ہے۔"

"میاں ۔۔!" بڑی چچی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا، "اللہ ہی ان سے سمجھے تو سمجھے۔ مگر تمہیں کہو میری شجوماں ایسی ویسی لڑکی ہے ۔!"

"ارے نہیں جی بھابی جان ۔۔ میں یہ کب کہہ رہا ہوں ۔۔؟ میں تو تمہیں ذرا سنانا چاہ رہا تھا کہ تمہارے والے ایسے گنوں ہیں۔"

"میاں ۔۔!" بڑی چچی پھر بڑے سہمے ہوئے لہجے میں بولیں، جس میں گھگھیاہٹ بھی شامل تھی ۔۔ بلا سے عمر ڈھل گئی۔ آج بھی کوئی ملے تو ہاتھ پیلے کر دیں اس کے۔ تمہاری نظر میں کوئی نہیں ۔۔ ؟"

بھائی جان، بھلے کو شجوماں کوئی حرامی پلہ ہی جن ڈالتی تو اتنی خرابی نہ ہوتی، مگر منگنی ہوئی بیٹی کی بات ٹوٹ کر تو ۔۔ اونہوں، یہ تو بڑی ناممکن سی بات ہے۔"

جلتے تیل کی بوندیں سی شجوماں کے کانوں میں گر رہی تھیں۔

"اوہ خدا ــــ یہ جوانی! کیا میں اب بھی جوان ہی دکھائی دیتی ہوں کہ لوگ یوں نام دھر سکیں۔"
اس نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا۔ ڈھلتا سورج زبان حال سے کہہ رہا تھا۔ "بس شام ابھی ہوا چاہتی ہے۔" پھر یہ دنیا ــــ اور دنیا والے ــ!

اماں نے ایک بار پھوپھی بی کے رنڈاپا چڑھایا تھا۔ پھوپھا میاں راتوں رات چٹ پٹ ہو گئے تھے۔ اماں بی نے پھوپھی بی کی کچ کچاتی ہری ہری پتھر مار مار کے پھوڑی تھیں۔ گلابی ریشم کی پھولدار ساڑی نوچ کر بیوگی کی موٹی سی سفید چادر اوڑھا دی تھی۔ کالی کالی پوت کا لچھا کھینچ کر گلا سُونا سُونا کر دیا تھا اور کلیاں کروا کروا کے مسّی کی دھڑی چڑھوائی تھی۔

"میں بھی رنڈاپا چڑھا لوں گی۔"

"مگر وہ کہاں ہے، جس کے نام سے مجھے رنڈاپا اور رنڈاپے کی ویرانی مل رہی ہے۔؟"
اس نے بھرے دل سے سوچا۔ پھر پچھواڑے کے آنگن میں جا کر اس نے پتھر سے کاسنی کاسنی چوڑیاں کرچی کرچی کر ڈالیں۔ بالوں میں گلابی موباف تھی، اسے پھاڑ پھینکا۔ پھر کمرے میں آکر زعفرانی اوڑھنی اتار کر سفید کفنی جیسی موٹی ململ کی اوڑھنی اوڑھ لی۔

اتنا ہی ہوتا تو بس نہ تھا، مگر دوسرے دن سارا کیا دھرا اپنی جگہ رہ گیا۔

نصیر الدین کا بھانجا بڑا اکھٹو تھا۔ پڑھنے لکھنے میں بڑا بودا۔ اسکول میں چھپن مرتبہ تو بٹھایا تھا ـ مگر اُٹھ اُٹھ کر بھاگ آتا۔ نصیر میاں باجری کے بھٹوں کی طرح اسے دنا دن ٹھوکتے۔ آٹھ چوروں کی مار اس اکیلے کو پڑتی، مگر وہ الف بے کی تختی سے آگے نہ بڑھ سکا۔ نو برس کا ہو رہا تھا۔ نویں برس تو بچے چوتھی پانچویں بھی پاس کر لیتے ہیں۔ شبو ماں کی میٹھی زبان کی ہر جگہ تعریف ہو رہی تھی کہ دو کلاسیں ہو رہی ہیں۔ ماں نے بھائی سے کہا:ـــ

"بٹھا دو لے جا کے شاہجہاں بیگم کی جماعت میں۔ لگ جائے گا راستے سے۔"
نصیر میاں کے دل کو بھی بھا گئی۔ ستھرے صاف کپڑے پہنا کے۔ بغل میں بستہ دبوا کے شبو ماں کے گھر آئے۔ یہ دیوان خانے اپنی فوج کو پڑھاتی بیٹھی تھی۔ دروازے پر دستک دی۔ شبو ماں نے ایک منٹ سب بچوں کو ہاتھ بتا کر خاموش کیا، اور دستک دینے والے کو کہا:ـــ

"اندر آجاؤ۔"
آگے آگے روف میاں اور پیچھے پیچھے ماموں نصیر میاں۔ ایک دم شبو ماں سٹ پٹا کر کھڑی ہو گئی۔ الف بے کا قاعدہ ہاتھ سے گر گیا اور نگاہیں جھکی کی جھکی رہ گئیں۔ سفید آنچل

سر پر لرز رہا تھا اور وہ سمٹی سمٹائی کرسی کا ہتھا تھامے کھڑی تھی۔

"یہ ....... ب ....... ب ....... بچہ پڑھتا ہی نہیں ....... ب .. بالکل وہ ہے" نصیر میاں کی زبان تالو سے ٹکرا ٹکرا کر گر رہی تھی۔

"جی ....... م ....... م ....... میں پڑھاؤں گی۔ یہاں تو بھی ڈھیٹ آتے ہیں" وہ گھبرا کر ہنس پڑی۔

نصیر میاں بھی مسکرا دیئے۔ "جی ہاں — ذرا دھیان سے پڑھا دیجیئے گا۔ آپ کی بہت تعریف سنی ہے" اور وہ سلام کر کے، جواب کا انتظار کئے بغیر باہر نکل گئے۔

"آپ کی بہت تعریف سُنی ہے!"

"آپ کی بہت تعریف سنی ہے!!"

"آپ کی بہت تعریف سُنی ہے!!!"

بنجوماں کے دل سے ایسی خوشی پھوٹی کہ وہ پاگل ہوتے ہوتے رہ گئی۔

"ہاں بچو، تم نے بھی میری تعریف سُنی ہے۔؟"

"ہاں آپا جی — آپ بہت — بہوت اچھی ہیں" سب آگے پیچھے بول اُٹھے۔

یہ نصیر میاں جو تھے، اب تو جیسے کچھ بھی تھے سو تھے، مگر جوانی میں ان کا بڑا زور تھا۔ جلنے کون سی عینک آنکھوں پر چڑھائے بیٹھے تھے کہ کوئی صورت من کو نہ بھاتی۔ یہی وجہ تھی کہ چالیس کے اوپر ہونے آئے مگر اب تک بھی آدم بنے کسی گم نام حوا کو کھوجتے رہتے۔ ہزاروں ہی بھلی بری صورتیں تو آنکھوں سے گزری ہوں گی۔ مگر دل پر کوئی نہ چڑھی۔ بڑی بی کے قریبی سگوں میں آتے تھے۔ بڑے پڑھے لکھے تھے۔ ان کی بیٹھک میں ایسی بڑی بڑی آڑی چوڑی کتابیں تھیں کہ ضرورت پڑنے پر چاہو تو تکیہ بنا کر لے لو۔ کتّے والے سید صاحب کے بیٹے تھے۔ قریبی عزیزداری تھی مگر آنا جانا سب موقوف تھا۔ بات کچھ بھی تو نہ تھی۔ نصیر میاں کے باپ علی گڑھ جا کر پڑھ آئے تھے۔ اُس زمانے میں علی گڑھ جانا لندن جانے سے کم نہ تھا۔ اور پھر یہ یوں ہی کورے تو نہ چلے آئے تھے۔ ایم۔ اے ایل۔ ایل۔ بی کی لانبی چوڑی ڈگری ساتھ لائے تھے۔ اور ایک فوٹو بھی تھا۔ کالا کالا جبّہ سا پہنے، سر پہ ترچھی سی ٹوپی لگائے۔ پورے خاندان والوں میں وہ فوٹو گھومتا پھرا اور کئی لوگوں نے تو کچھ آس بھی باندھ لی، مگر بیچ میں یہ کتّے آن پڑے۔ علی گڑھ سے آتے آتے انور میاں اپنے ساتھ ایک ولایتی کتا اور کتیا لے آئے تھے۔ جو ان کے کسی انگریز دوست

نے بطور تحفہ دیئے تھے۔ یہ بڑے بڑے جھاڑے کتّے کہ دور سے دیکھو تو شیر سے نظر آتے۔ اس زمانے میں پورے خاندان پر دادا حضرت کی حکومت تھی۔ نماز روزے کے وہ بڑے پابند تھے دو دو حج کیئے وہ الگ۔ چار پانچ روزے تو کبھی نہیں گئے تھے۔ ہر جمعہ کو روزہ ہوتا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ میاں انور اپنے ساتھ کتے بھی اٹھا لائے ہیں تو پہلے پیار دلار سے سمجھایا کہ "دیکھو میاں، جس گھر میں کتّے ہوں رحمت کے فرشتے نہیں اترتے۔ فضول ناپاکی ہوتی ہے۔ بڑا نجس جانور ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔" مگر انور میاں نے ایک نہ سُنی۔ بس دادا حضرت کو تاؤ آگیا۔ انور میاں کا گھر میں آنا جانا ہی بند ہوگیا۔ اب یہ بات اتنے غصے۔ تے کی بھی نہ تھی، مگر غصہ میں تو ایک فرشتہ بھی شیطان بن جاتا ہے۔ دادا حضرت نے جڑ ہی اکھاڑ پھینکی۔ اور ان کو گویا ذات باہر کر دیا۔ انور میاں بھی دُھن کے، زیادہ صحیح لفظوں میں اپنی ضد کے، ایسے پکے تھے کہ ذرا بھی تو اثر نہ لیا اور اوپر سے غیر کف کی بیگم بیاہ لائے۔

انور میاں کا جب بھی ذکر نکلتا تو بڑے گھر والے طعنے سے۔ "اجی وہی کتے والے سید انور" کہہ کر یاد دلاتے۔ اور پھر ایسا ہوا کہ مٹتے مٹتے انور میاں کا نام ہی "کتے والے سید صاحب" پڑ گیا۔ مگر یہ ضرور تھا کہ کتے تو پالے، مگر کیا ہے جو اپنے معمولات میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ دیوان خانے کے باہر ہی ایک چبوترہ سا بنا دیا گیا تھا، جہاں دن بھر یہ دونوں کتا کتیا بیٹھے آنے جانے والوں کی پریڈ لیا کرتے تھے۔ یوں تو علی گڑھ سے انگریزی پڑھ آئے تھے۔ ڈھیر ساری کتابیں چاٹ ڈالی تھیں، مگر تھے وہی سچّے سیدھے مسلمان۔ اور خود ہی تو بولتے،۔

"اومیاں یہ علم ہمیں یہ تھوڑی ہی سکھاتا ہے کہ اپنا دین اور مذہب چھوڑ کر عیسائی بن جائیں۔"
یوں پہننے کو کوٹ پتلون بھی کبھی کبھار پہن لیتے، مگر مرتے مرگئے، وضع داری نہ چھوڑی۔ وہی شرعی پائجامہ، کھلی آستینوں کا کرتا چار کلی والا، سر پر رام پوری کالی ٹوپی اور ہاتھ میں نانا ابا کی دی ہوئی چھڑی۔ صبح کی نماز بھی شاذ ہی قضا ہوتی۔ ہاں عشاء کی نماز میں اکثر غپہ مار دیتے بولتے :۔ "کھانے کے بعد کم بخت کسی کام کا نہیں رہ جاتا میں۔ بڑی گنگی آجاتی ہے آنکھوں میں۔"

انھی کی اولاد یہ نصیر میاں تھے۔ جیسا بیج ویسا پودا۔ ان کے دماغ میں بھی ڈھیر سارا علم بھرا پڑا تھا۔ عمر کہاں کی کہاں پہونچ رہی تھی مگر اب تک کنوارے سانڈ بنے پھر رہے تھے۔ باپ چڑچڑاتے :۔

"ارے کم بخت تجھے تیرے علم نے یہی سکھایا ہے کہ سونگھ سونگھ کر چھوڑ دے۔"

ہنس کر رہ جاتے۔ باپ تو اس عمر میں چھ چھ بچوں کے باپ بھی ہو گئے تھے، یہ ابھی تک پتنگیں اڑاتے پھرتے تھے۔ کہتے تھے:۔

"جب تک کنوارے ہو، بچے ہو۔! شادی ہوئی کہ بڑھاپے نے آگھیرا۔" اپنے بھائے اب تک بھی بچے ہی بنے پھر رہے تھے!

شام کو چار بجے رؤف میاں گھر لوٹنے لگے تو شجو ماں نے کہلوا بھیجا:۔

"اپنے ماموں میاں کو سلام کہہ دینا ہمارا۔" رؤف میاں نے گردن اُٹھا کر اسے دیکھا اور سر ہلا دیا۔

یہ سلام کلام یہاں تک بڑھے کہ شجو ماں جان جان کر پہاڑے بھولنے لگیں، حساب غلط کر کر جاتیں تو پھر نصیر میاں ہی ایسے ہوتے جو غلطیاں نکالتے۔

"واہ بھئی واہ — یہ کوئی حساب ہوا۔ سولہ دونی بتیس ہوتے ہیں آپ چھتیس بتا رہی ہیں۔" یہ جھینپ کر رہ جاتی۔ مسکراہٹوں پر سے راشن اُٹھ گیا تھا۔ جی کھول کر مسکراتی، قہقہے لگاتی۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی، شجو ماں سوچتی، کہ ہزار منتوں سے پکارنے کے باوجود ایک بھی کوا تو نہ اڑا تھا!

اور پھر بڑی انہونی سے بات یہ بھی ہوئی کہ شجو ماں نے بقر عید پر اپنی پسند سے ہری بانکیں پہنیں، ان کے آگے پیچھے سرخ رنگ کے گوٹ چڑھوائے، اور پیسے ادا کر کے منہارن کو جب سلام کیا تو اُس نے بھی دل بھر کر دعائیں دیں۔

"اللہ سہرے کے پھول کھلائے، دلہن بنائے، جی کے ارمان نکالیں۔ تمہارا بھی بھلا ہوئے،" اور شجو ماں جو کسی کے بھی منہ سے یہ دعائیں سُن سُن کر سفید پڑ پڑ جاتی تھی، شرم سے تپ کر دودھ ابلی گاجر کی طرح لال لال ہو گئی۔

اور بڑی بات یہ کہ شجو ماں، جو پورے خاندان میں گھر گھسنی مشہور تھی، ٹھیل ٹھیل کر ماں سے کہتی:۔

"اماں — آخر انور چچا نے کتے پال لئے تو کیا گناہ کر ڈالا تھا؟ مذہب تو نہیں بدل لیا تھا نا؟ اب کرنے والے تو مر کھپ کر مٹی میں مل گئے۔ فضول آپس کی برائی سے کیا فائدہ۔ آپ ان کے گھر آتی جاتیں کیوں نہیں —؟"

نصیر میاں جو بھانجے کی خبر لینے آتے تو گھنٹوں خبر ہی لیتے رہتے۔ کبھی کھانا کبھی چائے اور کبھی یہ نہیں تو خالی پان ہی سہی۔ شجو ماں، جو ساری دنیا سے منہ موڑ کے راہبہ بنی بیٹھی تھی، پھر آدم و حوا کی ہنستی گاتی دنیا کو پلٹ رہی تھی۔

اور اب تو ایسا بھی ہوا کہ نصیر میاں کو کھانے پر روک لیا اور خود بھی کوئی میٹھا بنانے لپک پڑی۔

بات چیت کا موضوع بدلتے بدلتے اس پر بھی آگیا:۔

"آپ نے شادی کیوں نہیں کی ۔۔۔؟"

"پسند کی کوئی لڑکی ہی نہ ملی۔ اور جب لڑکی مل گئی تو اپنی عمر ڈھل گئی۔ مگر کوشش کریں گے کہ تقدیر بدل جائے" نصیر میاں مسکرا کر بولے:۔ "آپ بھی دُعا کیجئے"

صاف اشارہ تھا۔ اس سے زیادہ اور کوئی کیا کر سکتا ہے۔؟ ننھو ماں شرما گئی۔ منہ تپ گیا۔ آنکھیں اُٹھا کر بولی:۔

"آپ کوشش کیجئے، میں دعا کروں گی آپ کے لئے ۔"

پورے خاندان میں اڑ گئی کہ رزاق میاں والوں اور کتے والے سید صاحب کی آپس میں میل ملاقات ہو گئی۔ اور جو ذرا سنسنی خیز خبریں سننے اور سُنانے کے دلدادہ تھے انہوں نے یہ بھی اڑا دیا کہ نصیر میاں گھنٹوں رزاق میاں کی جوان بیٹی، جو اَن بیاہی ہے، کے یہاں جا جا کے بیٹھتے ہیں۔ اب آگے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ سنا ہے کچھ بات بھی ہونے والی ہے۔

لاکھ بات بھی ہونے والی تھی۔ مگر تھی تو کنواری ہی ننھو ماں۔ ماں نے اونچ نیچ سمجھانے کے لئے الفاظ ڈھونڈے بھی، مگر ملے نہیں۔ ننھو ماں ایسی ویسی عمر اور چال کی تو تھی نہیں کہ سمجھانے بجھانے کی ضرورت پڑتی۔ بولتیں بھی کیا؟ پھوپھی دبی زبان سے کبھی کبھار کہہ دیا کرتیں:۔

"زمانے والوں کے منہ کھلے ہیں بیٹی۔ ہماری پھوپھی بی بیاہی بھری، دو بچوں کی ماں، صاف لگا ہی دیا لگانے والوں نے کہ انو میاں سے ہنستی ہیں۔ انو میاں ان کے رشتوں کے بھائی آتے تھے"

ننھو ماں نے سنا ضرور، مگر یہ نہ سمجھا کہ یہ صاف ان پر ہی چوٹ ہے۔

نصیر میاں بھی مسکرا مسکرا بات کرتے۔ تعلیم یافتہ تھے، ڈگری یافتہ تھے۔ ہزاروں میں اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ بات کرنے میں منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ دل کے کھوٹے نہ تھے بچارے، ورنہ ہزار بار تو کفر توڑ تنہائیاں میسر آئیں۔ کوئی جیسے ہوتے تو کچھ تو نیت میں فتور آتا، مگر انہوں نے تو کبھی کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ پان بھی یہ بنا کر دیتیں تو کہتے:۔

"وہاں میز پہ رکھ دیجیئے۔ ابھی حساب میں الجھا ہوا ہوں"

نصیر میاں کی قدر و قیمت انہی باتوں سے شجو ماں کے دل میں دگنی ہوگئی تھی۔

شجو ماں کی دھندلائی آنکھیں، جو نیند سے بیگانہ تھیں۔ اب سپنے دیکھتیں۔ ایک پھٹے پرانے کپڑوں والا شہزادہ ان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ یہ دروازہ کھولتی ہیں۔ وہ چپ چاپ کھڑا مسکراتا ہے۔ پھر یہ مسکراہٹ اتنی پھیل جاتی کہ خواب ٹوٹ جاتا پھر نظر آتا کہ چھجے پر کھڑی کوؤں کے پیروں میں سونے کی پائلیں باندھ رہی ہے اور ہزاروں کوے اپنے کالے پر پھٹپھٹاتے۔ کائیں کائیں کرتے اڑے چلے جارہے ہیں۔ پیروں کی پھٹ پھٹ اتنی تیز ہوتی کہ شجو ماں کی آنکھ کھل جاتی۔

## شہرِ ممنوع

دادی بی نے ادھر کئی دنوں سے کہانی نہیں سُنائی تھی۔ آج وہ پھر پاندان گود میں لئے کہانی سنا رہی تھیں۔

"ہا ۔۔ بیچاری شہزادی۔ تھی نانصیبوں کی پوری۔ شہزادے کو ہر طرح ناز و نعمت سے رکھا، کھلایا، پلایا، اس کی محبت اپنے دل میں پالی۔ اور آخر کو وہ دغا دے گیا۔ پیاروں پیٹا کبوتر کی طرح پھر سے اڑ گیا یہ کہہ کر کہ:۔

"چین دیش کی شہزادی نے مجھ سے کہا تھا کہ جب تیرے لوہے کے جوتے گھس جائیں گے تب شادی کروں گی۔ اب اس کے جوتے سفر میں گھس گئے تھے۔ چلو شہزادہ چین دیش کو چلا گیا اور کہانی ختم ۔۔۔!"

آج اسحاق چچا کلائمکس میں گڑبڑ پیدا کرنے عین موقع پر نہ ٹپکے۔ بڑے آرام سے آئے ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اتار کے کھونٹی سے ٹانگی اور بولے:۔۔

"کیا زوردار شادی کی بھئی۔ دلہن والوں نے مسہری کے ڈنڈے سونے کے دیئے اور سونے کے پازیب کے علاوہ پاندان بھی سونے کا دیا۔"

کس کی شادی کا ذکر ہے میاں ۔؟" بڑی چچی جھپکیاں لیتی پڑی تھیں، کروٹ بدل کر بولیں۔

"ارے آپ کو نہیں معلوم! ۔ نصیر میاں کی شادی سے تو آرہا ہوں یہ

" ہائیں ! " بڑی چچی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں ۔ نصیر میاں کی شادی ؟ ہمیں تو رقعے بھی نہیں آئے مگر ........"

اسحاق میاں نے بس کی زوردار گالی دی ۔ وہ کتے کے بچے حمید میاں کے ہاتھوں میں انتظام تھا نہ ۔ وہ تو ہم سے کاٹے کھاتا ہے ۔ مجھے تو جلیل میاں راستے سے پکڑ لے گئے ۔"

"کس کی بیٹی ۔۔؟" بڑی چچی نے ڈوبتے لہجے میں پوچھا ۔

"غیر کف کی ہے ۔ نواب جانی کی پوتی ہے نا ۔ اتنے دنوں سے یہی تو جھنجٹ چل رہی تھی ۔ بڑی کوشش سے ہوا یہ پیام ۔۔۔ !"

" ہاں تو بھئی ، وہ کہانی ختم ہوئی ۔ اب یہ دوسری سنو ۔۔۔ ایک تھا ........"

" دادی بی بی ! " آنسو بھری آنکھیں لئے ، دونوں ہاتھوں سے اپنا دل پکڑے شجو ماں پوری طاقت سے چلا اُٹھی ، " آپ یہ کہانیاں مت کہا کیجئے ۔ آپ اپنا وقت الگ برباد کرتی ہیں اور دوسروں کی زندگیاں بھی تباہ کرتی ہیں ۔"

شجو ماں اتنی زور سے چلائی تھی کہ بچوں نے سہم کر اپنے چہرے قاعدے کی آڑ میں کر لئے ۔

" اوئی ۔۔۔ میں نے کس کی زندگی تباہ کی ۔۔ ؟ کہانی جیسی کہانی تھی ، شادی ۔ اے لو اور سنو ۔" اور وہ منہ میں پان دبا کر کٹ کٹ چھالیہ کاٹنے لگیں ۔

اک دم شجو ماں کے سارے بال سفید پڑ گئے ۔ چوڑیاں آپ ہی آپ ٹوٹ ٹوٹ کر گر گئیں ۔ آنکھیں دھندلا گئیں اور گالوں پر جھریاں پڑ گئیں ۔ اور پھر کانپتے ہاتھوں سے شجو ماں نے بغدادی قاعدہ اُٹھایا اور بھرائی ہوئی آواز سے پڑھانے لگی : ۔

" پڑھو میرے بچو ۔۔۔ !

الف سے انار

بے سے بکری

تے سے تلوار ۔۔۔"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

# آکھان

ترجمہ :- ایس۔ ایم حیات بادشاہ

دروازے کے دونوں پٹ اس نے دھڑام سے بند کر دیئے۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے سندرم کے سر پہ جیسے کئی ہتھوڑے برس پڑے۔ وہ اُٹھا اور دروازے کے قریب پہنچ کر کواڑ آہستگی سے کھٹکھٹانے لگا۔ جواب میں طویل خاموشی کے سوا اور کچھ نہ ملا۔

"بھگیرتی!" ــــ سندرم نے بے جان اور نحیف آواز میں پکارا ــ "بھگیرتی!!" ــــ دروازے بند کے بند ہی رہے۔ اندر سے چٹخنی چڑھا دی گئی تھی۔ چند لمحوں کے سکوت نے سندرم کو بےچین اور مضطرب کر دیا۔ اپنی مٹھی بھینچ کر اس نے دروازے پر مارا۔ "کیا تم دروازہ نہیں کھولو گی؟" ــــ چند لمحوں کے بعد اس کے کانوں نے محسوس کیا کہ بھگیرتی کے قدم دروازے کی طرف آگے بڑھ رہے ہیں۔ پھر اندر سے چٹخنی اُتاری جانے لگی دوسرے لمحہ جونہی سندرم دروازے کے دونوں پٹ کھول کر اندر داخل ہوا تو اس نے دیکھا بھگیرتی دوڑتی ہوئی اپنے بستر پر جا گری تھی اور سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی تھی۔ شدّتِ غم سے بھگیرتی کی جو حالت ہو رہی تھی سندرم سے دیکھی نہ گئی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"بھگیرتی!" ـــــ سندرم نے آہستہ سے پکارا۔

بھگیرتی نے اپنا چہرہ اُوپر اُٹھایا اور آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے سندرم کو دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے بھگیرتی؟ کیا پجھرماں نے کچھ کہا ہے؟"

جواب میں بھگیرتی بہ لب دیکھتی رہی جیسے سندرم کا یہ بے معنی سوال کسی جواب کا مستحق نہ تھا۔

"کیوں نہ ہم بنارس ہو آئیں؟ ماں کی بھی یہی خواہش ہے" ـــــ منانے کے انداز میں سندرم کہنے لگا ـــــ "اور ہاں بھگیرتی اس سے پہلے ہم نے شمال کا سفر بھی تو نہیں کیا ہے"

سندرم کے چہرے پر بھگیرتی کی نگاہیں مرکوز تھیں۔ اس کے لبوں پر مرگ کا سکوت طاری تھا۔

بھگیرتی کے گالوں پر بہے ہوئے آنسو اپنے دھندلے سے نقوش چھوڑ کر خشک ہو چکے تھے۔ وہ سندرم کو دیکھ رہی تھی کہ آنسو کا ایک قطرہ اُس کے منہ میں چوری سے داخل ہو کر نمکین ذائقہ چھوڑ گیا۔

"یا تو اسے لوٹ کر میں اپنی ماتاجی کو سب کچھ ـــــ ہاں بھگیرتی ـ میں سب کچھ۔۔۔" الفاظ جیسے سندرم کی زبان سے چمٹے جا رہے تھے۔ اس کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی ـــــ "میرا مطلب یہ ہے۔۔۔۔۔"

بھگیرتی کی آنکھوں میں امید کی کئی شمعیں پھر فروزاں ہونے لگیں۔ وہ سراپا اشتیاق بنی سندرم کے ادھورے فقرے کی تکمیل کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔ لیکن سندرم کی آواز گنگ ہو چکی تھی۔ اس کی قوت گویائی جیسے سلب ہو چکی تھی۔ اُس کے ساتھ ہی بھگیرتی کی آنکھوں میں تمناؤں کے چراغ ایک بار پھر بھڑک کر ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گئے۔ وہ شدّتِ احساس سے تلملا اٹھی۔

"آج تک تم نے اپنی ماں کو نہیں بتایا۔ کیا تم ہمیشہ کیلئے انھیں اندھیرے میں رکھنا چاہتے ہو؟" ـــــ بھگیرتی کے لہجہ میں سندرم سے جواب کا مطالبہ تھا۔

"سنا تم نے ـــــ؟" قدرے توقف کے بعد پھر بھگیرتی نے اسی لہجہ میں کہا۔

"بات یہ ہے بھگیرتی ـــ میں ـــ وہ ـــ میری ماتاجی ـــ" سندرم سے
کوئی جواب بن نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ یونہی زیرِ لب بڑبڑانے لگا۔
بھگیرتی وہیں گم سم بیٹھی اُسے تک رہی تھی لیکن چند لمحوں کے بعد سندرم اپنے
آپ کو کمبل میں ڈھانپ کر تکیہ کے سہارے لیٹ گیا اور تھوڑی ہی دیر میں خراٹے بھرنے لگا
سارے تفکرات اور ذمہ داریوں سے بے نیاز معصوم بچے کی طرح نیند کی
آغوش میں سندرم کو دیکھ کر بھگیرتی کے دل میں اُس کیلئے ہمدردی جاگنے لگی۔ وہ اسے
ماں کی سی شفقت سے بغیر پلکیں جھپکائے دیکھتی رہی غیرارادی طور پر اس کے ہاتھ
سندرم کے سر تک بڑھے اور وہ اس کے گھنے بالوں کو سہلانے لگی۔ یہ جذباتی کیفیت
صرف وقتی ثابت ہوئی۔ جیسے ہی اس شام کے واقعہ کی یاد بھگیرتی کے ذہن میں ابھر
آئی اس کی وہ قلبی کیفیت حد درجہ نفرت میں بدل گئی۔ ایک جھٹکے سے اس نے
اپنے ہاتھ کو کھینچ لیا اور تکیہ میں اپنا منہ چھپا کر رو پڑی۔
"ایک بانجھ عورت سے کیا حاصل؟" ـــ ساس کی آواز کی بازگشت
بھگیرتی کے کانوں میں گونجنے لگی ـــ "وہ درخت کس کام کا جس سے پھل نہ
ملے؟ بہت ہو چکا۔ برداشت کی آخری حد تک میں نے سب کچھ سہا ہے۔ ایک دو
نہیں پورے نو سال تک میں نے ضبط کیا۔ ہمارے خاندان میں اس سے پہلے ایسا
کبھی نہیں ہوا۔ روپیہ میں نے پانی کی طرح بہایا۔ منتیں مرادیں مانگیں۔ ٹونے ٹوٹکے
کئے۔ گیتا اور رامائن کا پاٹھ رکھوایا لیکن کچھ نہ ملا ـــ کچھ نہ ہوا" ـــ سندرم
چپ چاپ کھڑا سنتا رہا۔ بھگیرتی اپنے کمرہ میں بیٹھی سب کچھ سن رہی تھی۔
"سندرم!" ـــ ماں اپنے بیٹے سے کہے جا رہی تھی ـــ "میری سمجھ میں
نہیں آتا تیری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ کبھی کسی بانجھ عورت کی گود ہری ہوتے تو نے سنا
ہے؟ خیر رہنے دے۔ موہوم سی ایک امید رہ گئی ہے۔ اُسے بھی آخری بار آزما کر
دیکھ لیں گے۔ بنارس جا۔ پوتر گنگا جل میں اُسے اشنان کرنے دے۔ بھگوان نے
چاہا تو اس کی گود بھر جائے گی۔ لیکن یہ بات کان کھول کر سُن لے۔ میں چھ مہینے تک
اور انتظار کر دوں گی۔ پھر بھی اس کی گود نہ بھری تو مجھے تیرے لئے دوسری دلہن لانا
پڑے گا۔ پوتے اور پوتیاں دیکھنے کھلانے کیلئے میں ترس گئی۔ دھرتی ماتا کی طرح

ہیں یہ سب کچھ نو سال سے سہتی آئی ہوں......"

بھگیرتی کو امید تھی کہ سندرم اس کی طرفداری کریگا۔ ماں نے الفاظ کی جو بوچھار کی اس کے جواب میں وہ اپنی زبان کھولے گا۔ اور در حقیقت کہنے کیلئے تو بہت کچھ تھا۔ لیکن سندرم نے اس کی امید پر پانی پھیر دیا۔ وہ پتھر کے بیجان بت کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ سندرم سے ماں کے سوالات کا معقول جواب دینے کی صرف توقع ہی کی جا سکتی تھی کیونکہ سندرم پر نہیں سارے گھر پر اُس کی ماں کا اقتدار چھایا ہوا تھا۔ سندرم کے باپ بہت بڑی جائداد چھوڑ کر ایک عرصہ ہوا سورگباش ہو گئے تھے۔ اُس بڑی جائداد کی دیکھ بھال اور دوسرے اختیارات اُس کی ماں کے ذمہ منتقل ہو گئے۔ اُس کا ماموں اس ملکیت کی نگرانی میں اس کی ماں کا ہاتھ بٹاتا تھا لیکن اُس کی بھی مجال نہیں تھی کہ گھر کے دوسرے معاملات میں مداخلت کرے۔ بھگیرتی کو اس بڑھیا نے اس کی دلکش اور جاذبِ نظر حسن کی وجہ سے اپنے بیٹے سندرم کیلئے پسند کیا تھا۔

شادی کے ابتدائی سال رنگینیوں مسرتوں اور خوشیوں سے ہمکنار رہے لیکن چوتھے سال کے آغاز نے بھگیرتی کی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ رنگینیاں مٹنے لگیں۔ مسرتوں کے پھول خزاں کے زد میں آنے لگے۔ خوشیوں کا چاند گہنانے لگا۔ بوڑھی ساس پہلے پہل اشارات وکنایات میں اور اس کے بعد کھلے منہ اس کی گود نہ بھرنے کی شکایت کرنے لگی۔ ہر مہینے بھگیرتی کو ساس کی جھڑکیاں اور طعنے سننے پڑتے۔ اُس کی زندگی کی جنت آہستہ آہستہ دوزخ میں تبدیل ہونے لگی۔ سندرم کی ماں بھگیرتی پر برس پڑتی۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گذرا ہو جس میں بھگیرتی کو بانجھ عورت کہہ کر اس کا دل نہ دکھایا گیا ہو۔ بانجھ عورت کی نظروں میں ہمیشہ برائی رہتی ہے۔ یہ ساس کا عقیدہ تھا اور وہ اپنے اس عقیدہ کا کھلے بندوں اس طرح اظہار کرتی جیسے اُسے اپنی بہو کے احساسات اور جذبات کا ذرا بھی پاس نہ ہو۔

---

سارے گاؤں میں یہ بات پھیلتے دیر نہ لگی۔ کوئی بھگیرتی کو ہمدردی اور ترس بھری نظروں سے دیکھتا۔ کوئی نفرت اور خوف سے۔ دوست احباب بھی بھگیرتی

سے کترانے لگے۔ بھگیرتی کی زندگی کا یہ المیہ پہلو تھا جس کا احساس اسے گھن کی طرح
کھائے جا رہا تھا۔ اس کا اپنا دل بھی اُسے کرب واذیت میں مبتلا کر دیتا۔ مرغی
کے پیچھے پیچھے دوڑتے ہوتے ہوئے ننھے منّے چوزے، سڑک کے کنارے جھپکی لیتی
ہوئی کتیا کے تھنوں سے منہ لگائے کُتّے کے چھوٹے چھوٹے بچّے، کام کے دوران
اپنے بچہ کو سینے سے چمٹا کر دودھ پلانے والی صحت مند دیہاتی عورت ——
یہ تمام منظر جنہیں بھگیرتی گاؤں کے تالاب سے پانی بھر کر لاتے وقت اکثر دیکھا کرتی
تھی اس کے جگر کو چھلنی کئے دیتے تھے اور وہ کلیجہ مسوس کے رہ جاتی۔ ساس کو
گائے سے دودھ دوہتے دیکھ کر ایک دن بھگیرتی کے جسم میں ایک شدید اضطراب
سا دوڑ گیا تھا۔ ڈول کے دودھ سے بھرتے ہی اُس کے منہ سے ضبط کے باوجود
ایک چیخ نکل پڑی اور وہ دوڑتی ہوئی اپنے کمرہ میں چلی گئی۔

ایک مہینہ پہلے بھگیرتی اپنے شوہر کے ساتھ ایک تقریب میں اپنے میکے
ترچنا پلی گئی تھی۔ ایک دن دونوں سری رنگم کے مندر کے درشن کیلئے چلے، یکہ
آدھے ہی راستہ میں ایک مشہور لیڈی ڈاکٹر کے مکان کے سامنے رک گیا اور
بھگیرتی اُتر پڑی۔

"کیا تم میرے ساتھ اندر نہیں چلو گے؟" بھگیرتی نے اپنے شوہر سے کہا۔

"وہ ٹھہریں تمھاری سہیلی! ہے نا؟ میرا اُن سے کیا کام؟" سندرم نے کہا
—— "میں یہیں تمھارا انتظار کروں گا۔"

"میرے خیال میں یہ اچھا ہوگا کہ یکہ میں بیٹھے رہنے کی بجائے تم اندر چل کر
ویٹنگ روم میں میرا انتظار کرو۔"

بھگیرتی اپنے شوہر کو اپنے ساتھ مکان کے اندر کھینچ لے گئی۔ لیڈی ڈاکٹر
نے مسکراتے ہوئے اُن دونوں کا خیر مقدم کیا اور وہ بھگیرتی کو مکان کے اندر لے
گئی۔ سندرم نے دیکھا بھگیرتی اور لیڈی ڈاکٹر کسی خاص موضوع پر باتیں کر رہی
ہیں۔ اُس نے اس طرف کان لگا دیئے۔

"—— لیکن بھگیرتی، صرف تمھارا ہی معائنہ کافی نہیں ہے۔ مسٹر سندرم
کا معائنہ بھی ضروری ہے اور یہ کام میرے شوہر انجام دے سکتے ہیں۔" ——

لیڈی ڈاکٹر نے بھگیرتی سے کہا "وہ بھی ایک بڑے سرجن ہیں"
بھگیرتی جب معائنہ کے کمرے سے باہر نکلی تو اُس کے چہرے پر اطمینان کے آثار تھے۔
ڈاکٹر کی آواز پر کچھ پس و پیش کے بعد سندرم کو معائنہ کے کمرے میں داخل ہونا پڑا۔ تحقیق و تشخیص کے بعد ڈاکٹر نے سندرم کو چند خاص مشوروں پر عمل کرنے کی تاکید کی جنھیں لیڈی ڈاکٹر نے بھگیرتی تک اس کی آگہی کیلئے پہنچا دیئے۔
بھگیرتی کے چہرے پر کئی مہینوں سے چھائے ہوئے غم و اندوہ کے بادل چھٹ گئے اور اُن کی جگہ شادمانی اور مسرتوں کی زرباد چاندنی چٹک اُٹھی۔ ایک طلسمی اثر کے تحت اس کی حیات میں جیسے قوس قزح کی رنگینیاں رچ گئی تھیں۔ لیکن سندرم اس کی خوشی میں شریک نہ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کب اس قید سے آزاد ہو۔ کب یہاں سے نکل بھاگے۔

---

بنارس کو جانے والی ٹرین چیختی دوڑتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ بھگیرتی ایک کونے میں بیٹھی اپنے زندگی کے بیتے ہوئے واقعات کا تجزیہ کر رہی تھی جو اس کے ذہن پر پردۂ سیمیں کی تصویروں کی طرح اُبھرتے آرہے تھے۔ سندرم اس کی بغل میں بیٹھا ہوا بے معنی نگاہوں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اُس کی ماں سامنے کی نشست پر دراز نیند سے ہمکنار تھی۔
"سنئے!" بھگیرتی نے سندرم کو آواز دی۔
"وہ بھگیرتی کی طرف متوجہ ہوا۔
"کیا ماں جی کو اب بھی نہ بتاؤ گے کہ حقیقت کیا ہے۔ ترچناپلی کے ڈاکٹر نے تمھیں کیا کہا تھا؟ بھگوان! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ سچ بات کے اظہار کی جرأت تم میں کیوں نہیں ہے؟"
سندرم چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اُس کے ہونٹ جیسے سِل گئے ہوں۔
"تم بزدل ہو!" بھگیرتی غصہ میں چلّا اُٹھی ـــ "لیکن یہ بات تمھیں بتانی ہی پڑے گی۔ کیا ماں جی کی طرح تمھیں بھی دوسری لڑکی بیاہ لانے کی تمنّا ہے؟ تم چاہتے اُس معصوم کی زندگی بھی اجیرن ہو جائے؟ میں ایسا کبھی نہ ہونے دوں گی! بہت

رسوا چکی ہوں۔ مجھ میں اور سہنے کی سکت نہیں ہے۔ بھگوان کیلئے مجھے دنیا کی نگاہوں میں اور تماشہ نہ بناؤ ـــــ"

وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

---

گنگا کے کنارے کھڑی سندرم کی ماں نے پنڈتوں سے اُن کا محنتانہ اور رسومات کی ادائیگی کے متعلق نرم گرم باتیں کر کے سو روپے قبول کرنے پر رضامند کر لیا تھا اور اب مذہبی رسومات کی تکمیل انجام پانے لگی۔

"اور پوری طرح سے ڈبکی لگانا!"

ماں نے بہو اور بیٹے دونوں کو جو پانی میں آگے کی طرف بڑھ رہے تھے تاکید کی۔

پانی کو گرداب کی طرح تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے دیکھ کر بھگیرتی چند لمحوں کیلئے سہم سی گئی۔ جوں ہی کانوں میں ساس کی آواز گونجی بھگیرتی نے گھٹنوں کو خم دیتے ہوئے آہستگی کے ساتھ اپنے سارے جسم کو گہرے پانی میں ڈبو دیا۔ رسم کے مطابق گنگا کے مقدس پانی میں تین بار ڈبکیاں لگانے کے بعد سندرم اُٹھ کھڑا ہوا لیکن بھگیرتی؟

"بھگیرتی!!" ـــــ سندرم کی ماں چیخ اُٹھی۔

کافی تلاش کے بعد انھیں بھگیرتی کا بے جان جسم ہی مل سکا!!

شام کو جب ماں اور بیٹے گھر پہنچے اور چراغ روشن کیا تو جس چیز نے اُن دونوں کی نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا وہ ایک نیلا لفافہ تھا۔ لفافہ پر بھگیرتی کی تحریر تھی۔ بوڑھی ماں نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا۔

پوجیہ ماں جی!

میں گنگا ماتا کی مقدس آغوش میں پناہ ڈھونڈھنے جا رہی ہوں۔ میں چاہتی تھی کہ اپنے جیون ساتھی کے سہارے زندہ رہوں۔ میری یہ خواہش صرف خواہش ہی رہی۔ اُنھوں نے مجھے سہارا نہیں دیا۔ آپ نے مجھے بانجھ سمجھا لیکن میں بانجھ نہیں ہوں۔ میری گود بھر سکتی تھی۔ میری گود نہ بھرنے کے ذمہ دار آپ کے بیٹے ہیں۔ ترچناپلی میں ڈاکٹر نے انھیں چھ مہینوں کے علاج کی رائے دیتے ہوئے

یقین دلایا تھا کہ ہماری گود بھرے گی اور ضرور بھرے گی۔ لیکن اس حقیقت کے اظہار کی جرأت اُن میں نہیں تھی۔ میری ہر پکار بے سود ثابت ہوئی۔ میری ہر تڑپ رائیگاں۔ انھوں نے اپنی کمی دور کرنے کیلئے کچھ نہیں کیا اور میں بہو تھی۔ آپ کے بیٹے کی کمی بتانے کی جرأت میں کیونکر کر سکتی تھی۔ کوئی عورت کوئی بہو بانجھ بھی ہو تو کیا اسے تڑپا تڑپا کر موت کے منہ میں ڈھکیل دیا جائے جیسا کہ میرے ساتھ کیا گیا؟

میں آپ سے بنتی کرتی ہوں۔ آپ بھی عورت ہیں۔ عورت کے درد کو جانتی ہیں۔ اپنے بیٹے کیلئے بہو نہ لائیے گا۔ اس معصوم پر رحم کیجیے گا۔ ایسا کرنا ہی چاہیں تو پہلے اپنے بیٹے کی کمی دور کر لیجیے گا۔

آپکی بدنصیب بہو بھگیرتی۔"

سندرم کی ماں نے اس خط کو چراغ کی لو پڑھا کر شعلہ کی نذر کر دیا۔ بھگیرتی کے باپ ماں اور دوسرے لوگوں کے آنے تک بھگیرتی کا خط جل کر راکھ ہو گیا لیکن بھگیرتی کے الفاظ عرصہ دراز تک ماں اور بیٹے دونوں کے دلوں میں نشتر کی طرح چبھتے رہے!

---

لڑکپن کی وہ رات میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا، جس نے میری زندگی کا رخ بالکل نئی سمت میں موڑ دیا تھا اور میرے اندر ایک عجیب و غریب انقلاب ابھر آیا تھا — ایسا انقلاب جس کا میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

تیرہ، چودہ سال کی عمر تک میں بہت ہی ڈرپوک تھا۔ ایک دفعہ سونے کے کمرے میں کہیں سے ایک چوہیا داخل ہو گئی اور الماری میں جا گھسی۔ جب وہ دوڑی اور اس کے دوڑنے سے آواز پیدا ہوئی تو میں نیند سے ہڑبڑا کر اٹھا اور اپنے بڑے بھائی کے ساتھ چمٹنے لگا۔ بڑے بھائی صاحب نے ایسی ڈانٹ پلائی کہ میں سہم کر رہ گیا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ رات تکلیف میں گزری تھی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میرے والد صاحب جنگلات کے محکمے میں افسر تھے۔ میسور سے تیس میل کے فاصلے پر ایک نہایت ہی خوبصورت گاؤں لاجوردی تھا۔ والد صاحب کا ہیڈ کوارٹر یہی گاؤں تھا۔ یہ گاؤں ایک نہایت ہی سرسبز پہاڑی کے دامن واقع تھا پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ دن کے وقت تو یہ پہاڑیاں نہایت اچھی لگتیں، لیکن رات کی تاریکی میں یہ مہیب دیو کی شکل اختیار کر لیتیں۔ میں تو سرِ شام ہی گھر آ جاتا اور رات کو

بالکل باہر نہ نکلتا۔

اور آخر کار وہ دن آپہنچا جس نے میری زندگی کے سارے تار ہلا ڈالے۔ ہوا یوں کہ ہم چند دوستوں نے قریب کی پہاڑی پر پکنک منانے کا پروگرام بنایا۔ ہم نو دس بجے کے قریب گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ ہمارے ساتھ ایک نوکر بھی تھا۔ شام ڈھلنے کے قریب میں اور میرا ایک اور دوست منوہر اپنے باقی ساتھیوں سے ذرا دور جا نکلے۔ منوہر نے مجھے بتایا کہ یہاں سے بالکل قریب ایک درخت ہے جس پر نہایت ہی لذیذ پھل لگتے ہیں۔ میں کئی دفعہ وہاں جا چکا ہوں۔ آؤ ہم دونوں چلیں، اگر دوسرے ساتھیوں کو پتہ چل گیا تو وہ سب کچھ چٹ کر جائیں گے۔ اس نے اس لذیذ پھل کا ایسا نقشہ کھینچا کہ میرے منہ میں پانی بھر آیا اور وقت کا اندازہ کئے بغیر ہم دونوں اس درخت کی طرف چل دیئے۔ چلتے چلتے اندھیرا چھا گیا۔ لیکن وہ درخت کہیں نظر نہ آتا تھا۔ میں نے گھبرا کر منوہر سے پوچھا کہ کتنا فاصلہ اور طے کرنا ہے؟ اس نے جواب میں کہا میں راستہ بھول گیا ہوں۔ تم ذرا یہیں ٹھہرو میں اوپر جا کر راستے کا جائزہ لیتا ہوں۔ تیز ہوا چل رہی تھی اور پہاڑی راستہ نہایت خطرناک تھا۔ نیچے مہیب گڑھے تھے اور اوپر دیو قامت درخت شائیں شائیں کر رہے تھے۔ میں تھوڑی دور تک منوہر کو اوپر چڑھتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر وہ درختوں کی اوٹ میں آ گیا۔ پانچ چھ منٹ کے بعد میں نے ایک دلدوز چیخ سنی۔ یہ منوہر کی آواز تھی۔ میں ڈرپوک ہونے کے باوجود اس طرف دوڑا اور دوڑتا چلا گیا۔ لیکن اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور پھر میرا پاؤں ایک پتھر سے ٹکرایا اور میں پیٹھ کے بل پیچھے کی طرف گرا ـــــ اور گرتے ہی بیہوش ہو گیا۔ میں جب ہوش میں آیا، اس وقت میرے جسم کا ایک ایک عضو سخت درد کر رہا تھا۔ میں دو چار منٹ اسی حالت میں پڑا رہا۔ اب میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے لگیں تھیں۔ میں اٹھ بیٹھا اور جب میری نظر آگے کی طرف پڑی، تو خوف کے مارے میری چیخ نکل گئی۔ صرف دو انچ آگے ایک مہیب گڑھا مجھے ہڑپ کرنے کے لئے منہ کھولے کھڑا تھا۔ اگر مجھے ٹھوکر نہ لگتی، تو میں بے خبری میں اس گڑھے میں دفن ہو چکا ہوتا۔ یہ خیال آتے ہی میری آنکھوں کے سامنے منوہر کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ ضرور اسی گڑھے کی نذر ہو گیا ہوگا۔ خوف سے میرا دل بڑی طرح دھک دھک کر رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرے دل کی حرکت اب بند ہوئی ـــــ اب بند ہوئی ـــــ

ہر طرف مہیب سناٹا طاری تھا۔ دل چاہتا تھا کہ خوب جی بھر کر روؤں۔ میں نے بے اختیار اپنے دوستوں کو پکارنا شروع کر دیا۔ لیکن میری آواز کی بازگشت اتنی خوفناک تھی کہ کانپ اٹھا۔ میں یوں

ہی ایک انجانی سمت میں چلنے لگا۔ لیکن ہر وقت یہی خوف دامنگیر تھا کہ کہیں پاؤں پھسل گیا تو زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ خوف اور دہشت سے بدن میں خون منجمد ہوا جاتا تھا۔ میں ایک قدرے اونچی جگہ پر بیٹھ گیا اور بیٹھے بیٹھے اونگھ آگئی۔ معلوم نہیں یہ اونگھ کا وقفہ کتنا تھا کہ ایک گرجدار آواز نے مجھے بیدار کر دیا۔ دو منٹ کے بعد پھر وہی گرج پیدا ہوئی اور اس گرج سے پہاڑیوں میں ایک ارتعاش پیدا ہوا۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور میں تھر تھر کانپنے لگا۔ گرج کی یہ آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ میں پتھر کی طرح منجمد ہو گیا تھا۔ بالکل بے حس و حرکت۔ یہ آواز اور قریب آئی اور پتوں پر چلنے کی آہٹ پیدا ہوئی۔ میں نے اپنے اندر ایک برقی رَو دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ میں ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا اور بے تحاشا قریبی درخت کی طرف دوڑا۔ معلوم نہیں مجھ میں تیز دوڑنے کی ہمت کہاں سے آگئی تھی۔ میں جلد درخت پر چڑھنے لگا، لیکن چونکہ پہلے کبھی نہیں چڑھا تھا۔ اس لئے دھڑام سے نیچے آرہا۔ میں پسینے سے تر بتر تھا۔ شیر مجھ سے صرف تیس چالیس گز کے فاصلے پر تھا۔ میں اپنی تمام قوت مجتمع کر کے ایک بار پھر درخت پر چڑھنے لگا، لیکن پھر نیچے آرہا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ میری زندگی کا آخری لمحہ ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر یہ ڈھارس بندھی کہ شیر اسی جگہ پر کھڑا ہے اور مسلسل میری طرف دیکھے جا رہا ہے۔ میں نے ایک بار پھر اپنی قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا اور آخر کار اس درخت پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ شیر آہستہ سے غرّایا اور پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

مجھے وقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ میں بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ درخت پر بیٹھے بیٹھے بہت دور مجھے مدھم روشنیاں نظر آئیں اور یہ روشنیاں آہستہ آہستہ واضح ہونے لگیں۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ دوسری سمت سے بھی روشنیاں آگے بڑھ رہی ہیں۔ لیکن یہ روشنیاں کبھی بالکل غائب ہو جاتیں اور میں مایوسی کے اندھیاروں میں گم ہو جاتا۔ طویل انتظار کے بعد آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے یہ روشنیاں قریب آئیں۔ پھر مجھے آنے والوں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ وہ میرا اور منوہر کا نام زور زور سے پکار رہے تھے۔ میں نے اپنی پوری طاقت سے ان کی آوازوں کا جواب دیا۔ لیکن شاید وہ ابھی زیادہ فاصلے پر تھے۔ وہ مسلسل آوازیں دیتے رہے اور میں بھی جواب میں پکارتا رہا۔ درخت سے نیچے اترنے کا ابھی حوصلہ نہیں تھا۔ شاید شیر یہیں کہیں چھپا بیٹھا ہو۔ آخر کار انھوں نے میری آواز سن لی اور ان میں سے ایک نے چلا کر کہا:۔

"ابھی میں نے ایک انسانی آواز سُنی ہے اور وہ قریب ہی سے آئی ہے۔"

میں نے ایک گروہ کو اپنی سمت میں بڑھتے دیکھا۔ خدا خدا کر کے وہ میرے درخت کے قریب

آ گئے۔ میں درخت سے کود پڑا۔ میرے والد صاحب اس گروہ کی قیادت کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ خوشی کے ان لمحات میں مجھے منوہر کا خیال آیا اور میں نے انھیں بتایا کہ میں نے منوہر کی چیخ سنی تھی۔ وہ منوہر کی تلاش کرنے لگے۔ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں وہ مختلف سمتوں میں پھیل گئے۔ اچانک ایک کی نظر منوہر کی لاش پر پڑی وہ ایک پتھر کے ساتھ رکی ہوئی تھی۔ بڑی احتیاط سے کچھ لوگ نیچے اترے اور منوہر کو اوپر لے آئے۔ وہ مردہ نظر آتا تھا۔ لیکن ابھی اس کی نبض بہت آہستہ آہستہ حرکت کر رہی تھی۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ فرسٹ ایڈ کا کچھ سامان موجود تھا۔ اس کے سر پر پٹی باندھی گئی اور ہم اُسے گاؤں کی طرف لے چلے۔

گاؤں پہنچ کر والد صاحب سب سے پہلے منوہر کو گاڑی پر ڈال کر میسور لے گئے۔ اسے ہسپتال میں داخل کرایا۔ ڈاکٹروں نے حالت دیکھ کر مایوسی کا اظہار کیا، لیکن ایک ڈاکٹر نے اس میں زندگی کے آثار دیکھ کر اس پر خاص توجہ دی۔ چھ مہینے کے بعد منوہر تندرست ہو کر گھر آ گیا تھا۔

جب تک منوہر ہسپتال میں رہا۔ اس وقت تک میری زندگی معمول پر رہی۔ اس کے صحتیاب ہو جانے کے بعد میں نے پر پرزے نکالنے شروع کئے۔ میں ایک دفعہ موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا، اس لئے خوف بالکل کافور ہو چکا تھا۔ میں نے اب بندوق چلانی بھی سیکھ لی تھی۔ بڑے بھائی یورپ چلے گئے تھے، والد صاحب زیادہ تر دوروں پر رہتے تھے۔ میں کالج کے بعد زیادہ وقت سیر و شکار میں گزارتا، پھر والد صاحب کا تبادلہ وسطی ہند کا ہو گیا اور میں وہاں کے جنگلات میں خوب گھوما پھرا۔ کئی بار شیروں، چیتوں اور ہاتھیوں سے مقابلہ ہوا، اور ہر دفعہ میں نے انھیں مار گرایا۔ اب میں بھی جنگلات کے محکمے میں ملازم ہو گیا تھا۔ چار پانچ سال ہندوستان کے مختلف حصوں میں کام کرتا رہا اور اسے اتفاق کہئے کہ میں اسی گاؤں میں تعینات ہوا جہاں میری زندگی میں نہایت ہی خوشگوار انقلاب آیا تھا، لیکن یہ کیا پتہ تھا کہ تقدیر نے میرے لئے ایک اور معرکہ سر کرنا لکھا ہے، مگر یہ معرکہ حسرتوں کا رستا ہوا ناسور بن گیا۔

میں گاؤں کے ریسٹ ہاؤس میں آ کر ٹھہرا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار، راجو بہت ہی محنتی اور وفادار ملازم تھا۔ اس کی بیوی ایک مدت ہوئی مر گئی تھی اور اب وہ اپنے اکلوتے لڑکے کے ساتھ زندگی کے دن کاٹ رہا تھا۔ اس نے میری اتنی خدمت کی کہ میرے دل میں اس کے لئے بے حد احترام پیدا ہو گیا۔ وہ ریسٹ ہاؤس کے بالکل ساتھ ہی رہتا تھا۔ ایک رات — بھیانک اور ڈراؤنی رات وہ میرے پاس دوڑا ہوا آیا اور دھم سے میرے قدموں میں گر پڑا۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی اور وہ مرغِ بسمل

کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اور گڑگڑا کر التجا کر رہا تھا کہ میں اس کے اکلوتے بیٹے کو خونخوار چیتے کے چنگل سے چھڑا لاؤں۔ باہر گھپ اندھیرا تھا اور چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ راجو کی آنکھوں میں بھی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ میں اس کی اس حالت کو دیکھ کر اضطراب کے شعلوں پر لوٹنے لگا۔ میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر شیر کی تلاش میں نکل جانا چاہتا تھا۔ لیکن بارش دیوار بن کر حائل ہو رہی تھی۔

میں نے راجو کو زمین پر سے اُٹھایا۔ اسے دلاسا دیا اور اس سے اس حادثے کی تفصیل پوچھنے لگا۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے بتایا کہ مسلسل بارش کی وجہ سے میرا کمرہ ٹپکنے لگا تھا۔ پہلے تو میں نے اس بات کی کوشش کی کہ اسی کمرے کے ایک کونے میں پناہ مل جائے، لیکن کمرہ بہت زیادہ ٹپکنے لگا میں اور میرا لڑکا ریسٹ ہاؤس میں رات گزارنے کے لئے دوڑے۔ میں آگے آگے تھا اور رامو پیچھے پیچھے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ مصیبت آنے والی ہے، ورنہ میں —— میں ..... اس نے صرف اتنا کہا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے آنسوؤں میں اپنی بپتا جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

ابھی ہم چند ہی قدم دوڑے تھے کہ رامو کی چیخ بلند ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، خونخوار چیتا میرے لختِ جگر کو منہ میں دبوچے لئے جا رہا تھا۔

راجو کہہ رہا تھا کہ ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔ چیتا دور نہیں گیا ہوگا۔ اور جب تک اُسے پناہ گاہ نہیں ملے گی، وہ اپنا شکار نہیں کھائے گا۔ اسے امید تھی کہ اگر چیتا کا پیچھا کیا جائے تو رامو کی جان بچائی جا سکتی ہے۔ مجھ سے اس کی بے چینی دیکھی نہ گئی۔ میں نے اعشاریہ ۳۰۲ کی رائفل اُٹھائی اور برساتی پہن کر ٹارچ کی روشنی میں راجو کے ساتھ ہو لیا۔ ہم ابھی چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ بجلی کوندی اور پھر وحشتناک کڑک کے ساتھ ایک اونچی چٹان پر گری۔ ہم دونوں کے دل دہل گئے۔ لیکن رامو کے بچانے کا جذبہ ہمارے قدموں کو آگے بڑھاتا رہا۔ مجھے ڈر تھا کہ چیتا کہیں قریب ہی چھپا ہوا نہ ہو اور غفلت میں آن دبوچے۔ ہمیں آدھ گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا، لیکن شیر کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

میں نے دفعتاً محسوس کیا کہ ہم سے چند گز کے فاصلے پر دو روشن آنکھیں ہمارا جائزہ لے رہی ہیں۔ بجلی کوندی اور میں نے اس کی روشنی میں دیکھا کہ چیتا ہم پر جھپٹنے کے لئے بالکل تیار تھا۔ میں نے اس سے پہلے بہت بڑے بڑے قد آور چیتے دیکھے تھے اور ان کا شکار کیا تھا۔ لیکن اس دُبلے پتلے چیتے کو دیکھ کر مجھ پر ایک انجانا سا خوف طاری ہو گیا۔ میں نے اپنی رائفل کا رُخ چیتے کی طرف کر دیا۔ میں یوں محسوس کر رہا تھا کہ کوئی نادیدہ قوت میرے ہاتھ سے رائفل چھین رہی ہے۔ میں نے اپنے ہوش و حواس پر قابو پانے کی پوری کوشش کی۔ میں جانتا تھا کہ اگر ایک لمحہ اور ضائع ہو گیا، تو چیتا ہم دونوں کی زندگی کا چراغ گل کر

دے گا۔ وہ جست بھرنے ہی والا تھا کہ میں نے گولی چلا دی۔ ایک شعلہ سا لپکا اور چیتے کے جسم میں پیوست ہوگیا۔ گولی لگنے کے باوجود چیتے نے چھلانگ لگائی اور مجھ پر جھپٹا۔ معلوم نہیں کیا ہوا کہ میرے ہاتھ سے رائفل گر گئی۔ چیتے کا پنجہ میرے پاؤں پر پڑا اور میں غالباً خوف و دہشت سے بے ہوش ہوگیا۔

جب میری آنکھ کھلی، تو میں نے اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا۔ میری ایک ٹانگ کاٹی جا چکی تھی۔ مجھے بعد میں بتایا گیا کہ اگر فوراً ٹانگ کاٹ نہ دی جاتی، تو میرا زندہ بچنا بالکل ناممکن تھا۔ مجھے اپنی ٹانگ کٹ جانے کا اتنا افسوس نہیں تھا جتنا اس بات کا کہ چیتے نے رامو کو ہلاک کر ڈالا تھا، اور راجو کی دنیا اجڑ گئی تھی۔

یہاں سے میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ٹانگ کٹ جانے کی وجہ سے مجھے ملازمت سے جواب دے دیا گیا ـــــ والد صاحب پہلے ہی انتقال کر چکے تھے اور بڑے بھیا یورپ سے واپس آنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ اب میں دو بچوں کا باپ تھا۔ زندگی گزارنے کے لئے بہرحال کچھ نہ کچھ کرنے کی ضرورت تھی۔ ویسے بھی میری مہم پسند طبیعت ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھنے کے حق میں نہیں تھی۔ میں جلد ہی لنکا کے باغات کا ٹھیکہ لینے میں کامیاب ہوگیا۔ رہائش کے لئے میں نے جنوبی ہند کے ایک نہایت ہی سرسبز و شاداب جگہ کو منتخب کیا۔ نیلگوں پہاڑوں کے عین دامن میں ماہوالا گاؤں آباد تھا۔ یہ گاؤں اپنی خوشگوار آب و ہوا اور فطرت کے حسین مناظر کے لئے دور دور تک مشہور تھا۔ میں نے اس گاؤں کے قریب ایک خوبصورت ہوٹل بنا لیا ـــــ ہوٹل کیا تھا۔؟ بانسوں، چٹائیوں اور کھپرے کی ایک کٹیا تھی۔ جسے سلیقے سے آراستہ کر لیا گیا تھا۔ اس ہوٹل میں صرف شکاری ٹھہرتے تھے، کیونکہ میں نے انھیں شکار کرنے کے لئے تمام سہولتیں مہیا کی ہوئی تھیں۔

یہ ننھا سا ہوٹل ایک ایسے گھنے جنگل میں تھا جو شیروں، چیتوں، ہاتھیوں اور ارنا بھینسوں کی آماجگاہ تھا۔ ہوٹل کی حفاظت کے لئے میں نے فولادی تختوں کی باڑھ لگا کر چاروں طرف ایک ایک فٹ کے فاصلے پر مضبوط اور تناور درخت لگا دیئے تھے۔ میری بیوی اور بچے ہوٹل سے دس میل دور شہر میں رہتے اور میں ہفتے میں ایک بار ان سے ملنے جاتا۔ شہر اور ہوٹل کے درمیان راستہ گھنے جنگل میں سے گزرتا تھا۔ اس پر یا تو ساتویں دن میری آسٹن کار دوڑتی یا ہوٹل کے ملازمین کے خچر اور شکاریوں کے گھوڑے چلتے پھرتے نظر آتے۔

یہ کچا راستہ درندوں کی زد سے محفوظ سمجھا جاتا تھا، لیکن ایک بار مجھے عجیب صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔

میں شہر سے واپس آ رہا تھا۔ ابھی نصف فاصلہ ہی طے ہوا تھا کہ میری چھٹی حس بیدار ہوئی اور میں نے غیر شعوری طور پر کار کو روک لیا۔ مجھے کسی درندے کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے چاروں طرف فضا کو سونگھا، مجھے ہاتھی کی بو محسوس ہوئی۔ میرے پاس بندوق بھی نہیں تھی۔ میں کار سے نکل کر ایک اونچے درخت کی طرف دوڑا۔ میری المونیم کی ٹانگ اوپر چڑھنے میں حائل ہو رہی تھی۔ اِدھر یہ عالم تھا کہ ایک جنگلی ہاتھی مستی میں جھومتا چلا آ رہا ہے۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا، میرے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ درخت کافی اونچا تھا۔ مجھے چڑھنے میں کافی دقت پیش آئی۔ ہاتھی نے یقیناً مجھے دیکھ لیا تھا۔ اسی لئے وہ اوپر سونڈ اٹھائے بڑی تیزی سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ جب وہ درخت کے قریب پہنچا، اس وقت میں بیس فٹ اونچے دو شاخے پر پہنچ چکا تھا۔ ہاتھی نے بار بار اپنی سونڈ کو بلند کیا لیکن میں اس کی پہنچ سے باہر تھا۔ اس نے طیش میں آ کر کار کو اپنی لپیٹ میں لینے کی کوشش کی اور پھر دس منٹ کے اندر اندر اس نے کار کا بھرکس نکال دیا۔ لیکن ساتھ ہی اس کی سونڈ سے خون کی ایک موٹی دھار بہہ نکلی۔ شیشے کے ریزے اس کی سونڈ میں کُھب گئے تھے۔ جب خون بہت بڑی مقدار میں بہہ چکا، تو وہ درختوں کو چیرتا پھاڑتا جنگل میں غائب ہو گیا۔

میں بہت دیر تک درخت پر بیٹھا رہا اور جب اطمینان ہو گیا کہ اب ہاتھی بہت دور جا چکا ہے تو پھر درخت سے اتر کر پیدل ہوٹل پہنچا۔ جس روز یہ واقعہ میرے ساتھ پیش آیا، اس سے ایک روز پہلے میری غیر موجودگی میں ایک بہت بڑا حادثہ ہو چکا تھا۔ میرا ذاتی ملازم بینا ایک روز پہلے قریب کے گاؤں میں دودھ لینے گیا تھا۔ جب وہ دیر تک واپس نہ آیا، تو دوسرے ملازموں کو تشویش ہوئی۔ وہ سب اس کی تلاش میں اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر بینا کا خچر مرا پڑا تھا۔ اس کی گردن ٹوٹی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے جسم پر کوئی خراش نہیں تھی۔ وہ چند ہی قدم اور آگے گئے، تو انھیں خون کی دھار دور تک جاتی ہوئی نظر آئی۔ وہ دھار کے ساتھ چلتے رہے۔ ایک فرلانگ دور جھاڑیوں کے جھنڈ میں یہ دھار گم ہو گئی۔ جھاڑیوں کے پیچھے بینا کی لاش پڑی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شیر نے تھپڑ مار کر خچر کی گردن توڑ دی اور بینا کو اُٹھا کر لے گیا۔ اس کے نازک اور نرم اعضاء کھانے کے بعد باقی لاش کو وہیں چھوڑ گیا تھا۔

یہ واقعہ پیش آیا تو ایک قیامت ٹوٹ گئی۔ خوف و ہراس ہر چہرے سے عیاں تھا۔ ہوٹل کے ملازمین بُری طرح ہراساں تھے۔ اور اتفاق کی بات ہے کہ ایک ہفتے سے ایک بھی شکاری ہوٹل میں نہ آیا تھا۔ اب کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں خود اس آدم خور کے مقابلے کے لئے جاؤں لیکن

خطرہ تھا کہ کہیں وہ ہوٹل کے ملازمین کو ایک ایک کر کے ہڑپ نہ کر جائے۔ یہ بات یقینی تھی کہ شیر بینا
کی لاش کی بچے کھچے حصے کھانے کے لئے دوبارہ اس جگہ آئے گا۔ اس طرح اسے آسانی سے ہلاک کیا
جا سکے گا۔

میں نے اپنے ملازموں سے کہا کہ وہ غروب آفتاب سے پہلے اس جگہ پر مچان باندھ دیں جہاں
بینا کی لاش ملی تھی۔ مچان کے لئے جو درخت منتخب کیا گیا، وہ ٹنڈ منڈ تھا۔ میں اپنی الونیم کی ٹانگ
کے ساتھ مچان پر جا بیٹھا۔ ملازمین نے رائفل، کارتوس اور ٹارچ وہاں پہلے ہی سے رکھ دی تھی۔
یہ جون کے وسط کی کوئی رات تھی۔ چاندنی چاروں طرف چٹکی ہوئی تھی۔ ماحول بہت رومان پرور
تھا۔ کبھی کبھی خنک ہوا کے تھپیڑے آنکھیں بند کئے دیتے تھے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ندی بہہ رہی تھی
ندی میں چاند کی کرنیں نہا رہی تھیں۔ میں اس حسین منظر میں محو تھا کہ اچانک جھاڑیوں میں سرسراہٹ
سی سنائی دی۔ میں چوکنا ہو گیا اور اپنی نگاہیں جھاڑیوں پر گاڑ دیں۔ جھاڑیوں کے پیچھے سے کوئی
چیز حرکت کر رہی تھی اور دو سرخ سرخ آنکھیں نمودار ہوئی۔ میں اس پر فائر کرنے ہی والا تھا کہ وہ تیزی
سے ایک طرف کو ہو گیا۔ اب وہ میرے بہت قریب آگیا تھا، میں نے غور سے دیکھا۔ وہ ــــ تو
ارنا بھینسا تھا۔ میں نے رائفل اطمینان سے رکھ دی۔ وہ اگرچہ انسان کا شکار نہیں کرتا، لیکن دشمن
کا مقابلہ انتہائی خوفناک طریقے سے کرتا ہے اور آخری وقت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا ــــ
ارنا بھینسا مزے سے گھاس کھانے لگا اور میں اسے دیر تک دیکھتا رہا۔
ابھی نصف گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ شیر کے دھاڑنے سے سارا جنگل گونج اٹھا۔ ایک لمحے
کے لئے میرے جسم میں بھی جھرجھری سی آگئی۔ میں نے رائفل پر ٹارچ لگائی اور آنے والے لمحات
کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ شیر وہیں دھاڑا تھا جہاں سے بینا کی لاش ملی تھی۔ غالباً وہ اپنا
شکار نہ پا کر غصے سے گرج رہا تھا۔ مشرقی سمت میں گھاس بہت لمبی اور گھنی تھی اور شیر کے دھاڑنے
کی آواز اسی طرف سے آئی تھی۔ میں نے ٹارچ روشن کی اور اس کی روشنی کو گھاس پر مرکوز کر
دیا۔ شیر بڑی تیزی سے ٹارچ کی روشنی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے اس کا نشانہ لیا اور قریب تھا
کہ میں فائر کر دوں کہ دفعتاً میری نظر ارنا بھینسے پر پڑی جو شیر کی گرج سن کر اس مقابلہ کرنے کے لئے
ایک جگہ جم گیا تھا۔ اس کی دم تیر کی طرح سیدھی ہو گئی تھی۔ اس پر یہ کیفیت اس وقت طاری ہوتی
ہے، جب دشمن بالکل سامنے ہوتا ہے! اور وہ زمین پر کھر مار کر اپنی قوت مدافعت مجتمع کرتے ہی
دشمن پر حملہ کر دیتا ہے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اونچی گھاس کے بالکل نزدیک ایک تنا ور

درخت کے نزدیک شیر کھڑا ارنا بھینسے کو گھور رہا تھا، پھر شیر آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور جس درخت پر میں بیٹھا تھا، اس کے تنے کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

یہ عجیب بات تھی کہ ارنا بھینسا تو زمین پر کھر پر کھر مار کر اپنی طاقت مجتمع کر رہا تھا اور نتھنے پھلا پھلا کر عجیب قسم کی آواز نکال رہا تھا۔ لیکن شیر بالکل ساکن کھڑا تھا۔ یکایک بھینسا بالکل سیدھا شیر کی طرف بڑھا اور پوری قوت سے ٹکر مارنے کے لئے اپنے نوکیلے سینگوں کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ جونہی بھینسا شیر کے قریب پہنچا۔ شیر نہایت پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا اور بھینسے کا سر درخت کے تنے کے ساتھ ٹکرایا۔ یہ ٹکر اس زور کی تھی کہ پورا درخت اپنی جگہ سے ہل گیا میں تو گرتے گرتے ہی بچا۔ اگر میں ایک ابھرتی ہوئی شاخ کو مضبوطی سے نہ پکڑ لیتا، تو یقیناً زمین پر آ رہتا۔ بھینسے کا ایک سینگ ٹوٹ گیا اور اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ بھینسا اُلٹے پاؤں پیچھے کی طرف ہٹا، تاکہ وہ دوبارہ ٹکر مارنے کے لئے اپنی قوت مجتمع کر سکے۔ اس دوران میں شیر اپنی پہلی جگہ پر آ کھڑا ہوا اور اپنی خونخوار آنکھوں سے بھینسے کی طرف دیکھنے لگا۔ بھینسے نے نتھنے پھلائے، زمین پر کھر مارا اور ٹکر مارنے کے لئے شیر کی طرف دوبارہ لپکا۔ اس بار وہ پہلے سے زیادہ خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ کر آنکھوں اور نتھنوں تک میں چلا گیا تھا۔

شیر نے بھینسے کو جب اپنے قریب محسوس کیا، تو پہلے کی طرح تین چار قدم دائیں جانب ہٹ گیا۔ اس بار پھر اس کی ٹکر درخت کے تنے سے لگی، میں اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے پہلے ہی سے تیار تھا اور میں نے ایک مضبوط تنے کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ بھینسے کے سر میں بہت بڑا شگاف پڑ جانے کے باعث خون کی موٹی دھار بہنے لگی۔ شیر نے جب دیکھا کہ بھینسا لہولہان ہو چکا ہے اور اس میں وہ پہلی سی قوت نہیں رہی، تو اس نے یکدم جست بھری اور اس کی گردن پر سوار ہو کر دانت گاڑ دیئے۔ بھینسا اُچھلنے کودنے لگا۔ لیکن شیر کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ زخمی بھینسے کی ایک نہ چلی۔ اس سے پہلے کہ میں فائر کرتا، بھینسا شیر سمیت گھنے جنگل میں غائب ہو گیا۔

میں جلد سے جلد اس آدم خور کو ہلاک کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے آنے والی رات کو آخری معرکہ سر کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک گائے اس درخت کے نیچے بندھوا دی، جس پر مچان تیار کی ہوئی تھی۔ ابھی رات کا پہلا حصہ گزرا تھا کہ جھاڑیوں کے ٹوٹنے اور گھاس کے روندنے کی آواز آئی۔ "یہ شیر تو نہیں ہو سکتا،" میں نے اپنے دل میں کہا۔ یہ تو کسی بھاری بھرکم جانور کے پاؤں کی آواز ہے اور واقعی میرا اندازہ

صبح نکلا ایک قوی الجثہ ہاتھی جھومتا چلا آرہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی گائے سہم گئی۔ ہاتھی بڑا ہی زیرک جانور ہے۔ اس نے گائے کو رسی سے بندھا دیکھا، تو سمجھ گیا کہ انسان قریب ہی ہے۔ اس نے سونڈ اٹھا کر چاروں طرف سونگھنا شروع کیا اور اپنی چھوٹی آنکھوں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ ایک خیال مجھے بار بار بے چین کر رہا تھا کہ جس درخت پر میں بیٹھا تھا، وہ بالکل خشک اور ٹنڈ منڈ تھا۔ اس کے تنے کا محیط بھی زیادہ نہیں تھا۔ اگر ہاتھی نے مجھے دیکھ لیا، تو وہ کہیں تنے کو سونڈ میں لپیٹ کر درخت ہی کو جڑ سے نہ اکھاڑ دے۔ سرسبز درخت بعض اوقات شکاری کی جان کی حفاظت میں بہت مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

ہاتھی ابھی مجھے تلاش کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ میری قسمت نے یاوری کی اور بالکل نزدیک سے شیر کے دھاڑنے کی آواز آئی۔ گائے کا تو یہ حال تھا کہ وہ بالکل بے جان نظر آ رہی تھی۔ ہاتھی کی حالت دیدنی تھی، وہ ایک طاقتور حریف سے نبرد آزما ہونے کے لئے بے چین تھا۔ شیر کے جواب میں وہ زور سے چنگھاڑا کہ پورا جنگل لرز اٹھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ دونوں جنم جنم کے دشمن ہیں۔ دھاڑنے کا سلسلہ دو تین منٹ جاری رہا۔ دو موذی میرے سامنے تھے اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پہلے کس پر فائر کروں، میں نے فیصلہ کیا کہ گولی چلانے کے بجائے ان دونوں کو آپس میں لڑتا دیکھوں۔

کاش۔ ! میرے پاس کیمرہ ہوتا اور میں اس جنگ کو فلما سکتا۔ شیر اور ہاتھی کی یہ جنگ اتنی خوفناک تھی کہ میں کئی روز تک اس کے تصور ہی سے لرزتا رہا اور اب بھی جب میں یہ واقعہ سناتا ہوں، میرے رگ و پے میں خوف کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

شیر اور ہاتھی دو طاقتور حریفوں کی طرح ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑے تھے۔ ان کے درمیان تیس گز کا فاصلہ تھا۔ ہاتھی بار بار سونڈ اٹھا کر ادھر اُدھر پٹکتا اور اپنے انتہائی غصّے کا اظہار کرتا۔ شیر غراتا اور پھر سر کی ایک جنبش سے اس زور سے دھاڑا کہ دل دہل جاتے۔ اب دونوں کی قوت برداشت جواب دے رہی تھی اور ایک دوسرے پر پل پڑنے کے لئے بے چین تھا۔ کہ اچانک شیر کا پیٹ زمین پر لگا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ بس اب وہ جست بھرنے ہی والا ہے۔ ہاتھی بھی مقابلے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ جونہی شیر نے چھلانگ لگائی اور اس کی سونڈ کو جبڑے میں دبانے کی کوشش کی، وہ سونڈ کو پوری طاقت سے اوپر کی طرف لے گیا اور اس زور سے شیر کے منہ پر دے ماری کہ وہ لڑکھڑا کر دور جا گرا۔ شیر نے سنبھلتے ہی دوسرا وار کیا اور ایک بار پھر ہوا میں لہراتی سونڈ کو اپنے پنجوں کی گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ لیکن ہاتھی بھی ایک ہی کائیاں تھا، شیر کے جست بھرتے ہی وہ ایک جانب ہٹا اور دوسرے ہی لمحے شیر کو سونڈ میں لپیٹنے

کی کوشش کرنے لگا۔ شیر پھرتی سے درمیان میں سے نکل گیا اور دور جا کھڑا ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ دونوں حریف تھک گئے ہیں، اور دوسرا حملہ کرنے سے پہلے سستانا چاہتے ہیں۔

شیر ایک بار پھر دھاڑا اور اتنی اونچی چھلانگ لگا کر ہاتھی پر حملہ کیا کہ میں سمجھا کہ اُس نے مجھے دیکھ کر جست بھری ہے۔ غیر شعوری طور پر میری انگلی رائفل کی لبلبی تک پہنچی، لیکن جب میں نے دیکھا کہ شیر ہاتھی کی گردن پر سوار ہو کر منہ سے اُسے کاٹ رہا ہے اور اس کے نوکیلے پنجے اس کی گردن میں اچھی طرح پیوست ہو چکے ہیں تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہاتھی نے ہر ممکن کوشش کی کہ اُسے اپنی سونڈ میں جکڑ لے، لیکن شیر کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ سونڈ سے جدا نہ کر سکی۔ ہاتھی اپنے حریف کی طاقت کے آگے سپر انداز ہونے کے لئے تیار نہ ہوا اور اس نے آخری حربے کے طور پر وہی کیا جو ہر ہاتھی مجبور ہو کر کیا کرتا ہے۔

اس نے بالکل سرکس کے انداز میں پہلے سونڈ اوپر اُٹھائی اور پھر سر زمین پر ٹیک کر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ شیر زمین پر آ رہا۔ اس نے بھی گردن میں اپنے پنجے اس طرح گاڑ دیئے تھے کہ نکلنے کا نام نہ لیتے تھے۔ ہاتھی نے اب ایک اور ترکیب نکالی، سر ہی کے بل اس طرح قلابازی کھائی کہ شیر پر اس کے بھاری بھر کم جسم کا پورا بوجھ پڑ گیا۔ اب شیر کے منہ سے ہلکی ہلکی چیخیں نکلیں، جیسے اس کا انگ انگ ٹوٹ رہا ہو۔ ہاتھی نے اپنے جسم کو ذرا سی حرکت دی اور سونڈ کو شیر کی گردن میں حمائل کر کے اُسے جکڑنا شروع کر دیا۔ شیر نے بھی پنجوں سے اس گرفت کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ ہاتھی آہستہ آہستہ اُٹھنے لگا۔ اب وہ ہر حرکت میں ذہانت سے کام لے رہا تھا۔ وہ کسی صورت بھی شیر کو زمین سے اُٹھنے کی مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے اوپر اُٹھنے سے پہلے اپنا دایاں پاؤں شیر کے پیٹ پر رکھا اور پھر پورا زور دے کر کھڑا ہو گیا۔ شیر کے منہ سے ایسی خوفناک آواز نکلی کہ میں نے زندگی میں کبھی ایسی آواز نہیں سنی تھی۔ اس کا پیٹ پھٹ گیا اور خون کا فوارہ ابلنے لگا۔

ہاتھی کے انتقام کا جوش ابھی سرد نہیں ہوا تھا اور اسے شبہ تھا کہ کہیں یہ دوبارہ کھڑا ہو کر حملہ نہ کرے، وہ مسلسل اپنے بھاری بھر کم پاؤں سے اُس کے پیٹ کو مسلتا رہا۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ حریف مات کھا گیا ہے اور اب وہ کبھی حرکت نہیں کرے گا، تو اس نے مردہ شیر کی گردن سے سونڈ کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ ایک دو بار سونڈ سے شیر کو ادھر اُدھر لپیٹا، غالباً وہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ کہیں اسے دھوکا تو نہیں دیا جا رہا اور اُسے جب یقین ہو گیا کہ اس نے اپنے مدِ مقابل کو پوری طرح پچھاڑ دیا ہے، تو جشنِ مسرت کے طور پر اپنی سونڈ میں اس کا خون بھر بھر کر اپنے جسم

پھینکنے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے کسی جانور کو جوشِ انتقام میں دشمن کے خون سے نہاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے ایک بار پھر مردہ شیر پر حقارت بھری نظر ڈالی اور جنگل کے بادشاہ کو دوبارہ اپنے پاؤں تلے روندنا شروع کر دیا۔

میں جس آدم خور کا شکار کرنے آیا تھا، وہ شکار ہو چکا تھا۔ اب میرے سامنے خوفناک اور آتشِ انتقام سے بھرا ہوا ہاتھی تھا۔ ایک خیال بار بار میرے ذہن میں سرایت کر رہا تھا کہ ہاتھی شیر سے مقابلے کے بعد گائے کو سنسان جنگل میں باندھنے والے کی تلاش کا خیال بھولا نہیں ہوگا۔ میں نے رائفل کو مضبوطی سے پکڑا اور ہاتھی کی کنپٹی کا نشانہ باندھ کر لبلبی دبانے ہی لگا تھا کہ قانون کی بندش نے میرا ہاتھ روک لیا میرے پاس ہاتھی شکار کرنے کا لائسنس نہیں تھا۔ اس۔ سارے علاقے میں ہاتھی مارنا جرم ہے۔ لائسنس لے کر انھیں صرف زندہ گرفتار کیا جا سکتا ہے، تاکہ بار برداری کے کام میں لائے جا سکیں۔

میری نگاہیں چاندرات میں ہاتھی کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ہاتھی اپنی فتح کی خوشی میں مست تھا، وہ کبھی مردہ شیر کی گرد چکر لگاتا، کبھی پاؤں سے اس کے جسم کو رگیدتا اور کبھی بچے کھچے خون کو اپنی سونڈ میں بھر کر اپنے جسم پر بکھیرتا۔ وہ ایک گھنٹے تک یہی حرکتیں کرتا رہا اور پھر ایک خوفناک چیخ کے بعد جنگل میں چلا گیا۔

● ●

کیپٹن نے گرم کیتلی میں چینی چائے کی پتیاں ڈالیں تو باہر بارش شروع ہوگئی۔
ہری بھری ڈھلوانوں اور اونچے نیچے سبز ٹلوں پر چرتی ہوئی بھیڑ بکریاں ممیانے لگیں۔
پہاڑی چرواہے انھیں ہنکاتے ہوئے چنار اور تنگ کے گنجان درختوں تلے لے آئے۔ شام
ابھی نہیں ہوئی تھی لیکن بادلوں کی وجہ سے وقت سے بہت پہلے اندھیرا سا ہوگیا۔ وادی پر دھند کی
چادر سی پھیل گئی تھی۔ جس میں ڈھلوانوں پر اُگے ہوئے درخت اور سلیٹی رنگ کی ڈھلوانی چھتوں
والے مکان سپید سیاہی چوس پر دھبے سے معلوم ہو رہے تھے۔ کھلی کھڑکی میں سے پہاڑوں
پر چلنے والی ٹھنڈی اور نمدار ہوا اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس ہوا میں گیلے پتھروں کی بو سے لے
کر چیڑھ کی چوٹیوں پر جھولنے والے نوکیلے جھومروں کی خوشبو شامل تھی۔ کمرے میں پہنچ کر یہ خوشبو
چینی چائے کی مہک سے مل جاتی۔ اور کیپٹن نے اپنے دوست ڈاکٹر صدیقی کے سامنے آرام
کرسی پر بیٹھے کئی بار محسوس کیا کہ وہ پرانی فرنچ رم میں انناس کا رس ملا کر پی رہا ہے۔ وہ اپنے گھر
میں بیوی بچوں کے درمیان چھٹیوں کے پندرہ دن گزار کر اپنے فوجی ٹھکانے پر واپس جا رہا تھا۔
اور ڈاکٹر کے از حد اصرار پر رات کی رات وہاں ٹھہر گیا تھا۔ علاوہ ازیں اس قدر خراب موسم
میں وہ پہاڑ کی بھیگی ہوئی ڈھلوانی سڑکوں پر جیپ چلانے کا خطرہ مول لینے پر تیار نہ تھا۔

اور پھر ڈاکٹر صدیقی نے اسے خالص چینی چائے پلانے کا لالچ دیا تھا جو ایک دوست نے اُسے ہانگ کانگ سے بھیجی تھی۔ کیپٹن چائے کا اتنا رسیا نہیں تھا۔ لیکن یو تانگ کی چند ایک کتابوں میں اس نے اس کے متعلق اتنا پڑھا تھا کہ وہ پہاڑ پر پہنچ کر گرتی بارش میں چینی چائے کا ایک پیالہ ضرور چکھنا چاہتا تھا۔

ڈاکٹر صدیقی اس پہاڑی مقام کے ایک چھوٹے سے غیر سرکاری سینے ٹوریم کا انچارج تھا اور اسے ہسپتال کے پچھواڑے مختصر سا مکان رہنے کو ملا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کی عمر پینتیس کے قریب تھی اور اس کی کنپٹیوں پر سفید بالوں کی لکیریں نمودار ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ اس کے چند ایک اپنے اصول اور نظریات تھے جن پر وہ سختی سے کاربند تھا۔ ان میں ایک یہ بھی تھا کہ وہ عمر بھر شادی نہیں کرے گا اور آزاد رہ کر بیماروں کی خدمت کرے گا۔ اگرچہ وہ مضبوط جسم کا آدمی نہیں تھا مگر اس کی صحت کافی اچھی تھی اور عمر میں بہت کم بیمار ہوا تھا۔

یہ دونوں دوست آتشدان کے قریب آرام کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر بڑے انہماک سے سگریٹ بنا رہا تھا اور کیپٹن چینی چائے سے بھری ہوئی کیتلی کو پھولدار ٹی کوزی سے ڈھانپنے کے بعد پیالیوں میں شکر ڈال رہا تھا۔

"کتنے چمچ ڈاکٹر — ؟"

"صرف ڈیڑھ —"

بارش زیادہ تیز ہو گئی تھی اور کھڑکی میں سے اکتوبر کی سرد ہوا کے تیز جھونکے اندر آ رہے تھے۔ کھڑکی پر جھکی ہوئی پک اینڈ پک کی سرخ کلیوں والی بیل اپنی نازک ٹہنیاں جھاڑ رہی تھی اور سپید بادلوں میں چھپی ہوئی وادی کی جانب سے بارش اور تیز ہوا کے شور کے علاوہ بھیڑوں کے ڈکرانے اور بھیڑ بکریوں کے ممیانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

"سردی بڑھ گئی ہے —"

اتنا کہہ کر ڈاکٹر اُٹھا اور اس نے کھڑکی بند کر دی۔

مینٹل پیس کے اوپر ہوا میں جھولتا ہوا کیلنڈر اک دم رُک گیا اور کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ ڈاکٹر نے تازہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بجھی ہوئی دیا سلائی آتشدان میں پھینکی اور کمبل کو اچھی طرح شانوں پر پھیلاتے ہوئے کہا:۔

"اب تم یہ بتاؤ کہ وہ اطالوی لڑکی کون ہے — ؟ جس کی تصویر تم نے مجھے

جسم دکھائی تھی؛"

کیپٹن پیالیوں میں ہلکے سبز رنگ کی چینی چائے انڈیل رہا تھا۔ جس کی خوشبو ایسی تھی جیسے قریب ہی کسی نے چیڑھ کے درخت کا تنا کاٹ کر رکھا ہو۔ اطالوی لڑکی کے ذکر سے اس کے گندمی رنگ کے چوڑے جبڑوں اور لمبی ناک والے چہرے پر پھیکا سا تبسّم نمودار ہوا اور وہ ڈاکٹر کو اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے چمچ سے پیالی میں شکر ہلانے لگا۔ گرم چائے بھنور کی شکل میں پیالی میں آہستہ آہستہ گردش کرنے لگی۔ اور کیپٹن کو محسوس ہوا جیسے وقت کا چکر پیچھے کی طرف گھومنے لگا ہے اور وہ گزرے ہوئے راستوں دیکھی بھالی عمارتوں اور بھولے بسرے چہروں کے درمیان سے ہو کر گزر رہا ہے۔ اس نے سوچا۔ وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے۔ وہ مہمان بن کر ہمارے گھروں میں اترتا ہے اور چوروں کی طرح بھاگ جاتا ہے۔ وہ پھول اور قہقہے لئے آتا ہے اور قبریں اور آنسو چھوڑ کر چل دیتا ہے۔ وہ گزر جاتا ہے اور انسان باقی رہ جاتا ہے —

انسان پیچھے رہ جاتا ہے۔

پیالی میں چائے کا سمندر بھپر رہا تھا اور اس کی طوفانی سطح پر یادوں کے بادبانی سفینے ڈگمگا رہے تھے۔ ہر بات اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ ہر چہرہ پیچھے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ہر شے پیچھے پلٹ رہی تھی۔ یہ بالکل ایسے تھا جیسے کوئی مسافر بندھا ہوا بستر کھول رہا ہو۔ جیسے کوئی لڑکی بُنا ہوا سویٹر اُدھیڑ رہی ہو۔

کیپٹن نے وہ پگڈنڈی دیکھی جہاں سے وہ گزرا تھا۔ وہ چشمہ دیکھا جہاں سے اپنی پیاس بُجھائی تھی، وہ درخت دیکھا جس کی چھاؤں میں وہ گھڑی دو گھڑی سستایا تھا۔ اور وہ ٹیلہ دیکھا جس کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اس نے سورج کو غروب ہوتے دیکھا تھا۔ اور وہ لوگ دیکھے جو اسے گزشتہ دس سالوں کی طویل مسافت میں ملے تھے اور اسی ہجوم میں اس نے لمبے قد اور چھریرے جسم کی ایک لڑکی کو دیکھا، جس کی آنکھیں نیلی تھیں اور بال سرخ تھے اور ہونٹ کسی اطالوی سنگتراش نے یاقوت سے تراشے تھے۔ اس نے گہرے سرخ بالوں میں آلوچے کی سپید کلیاں سجا رکھی تھیں۔ جیسے بھڑکتے ہوئے شعلے ایک دم منجمد ہو گئے ہوں اور ان پر برف گر رہی ہو، اور وہ ایک طرف چپ چاپ کھڑی تھی اور پریشان نگاہوں سے اِدھر اُدھر تک رہی تھی۔ جیسے کسی محبوب اور مہربان چہرے کی جستجو میں ہو۔ اس لڑکی کا نام لبورے تھا اور اُس کی تصویر کیپٹن نے صبح کھانے پر ڈاکٹر کو دکھائی تھی اور اس نے پوچھا تھا۔

"یہ لڑکی کون ہے ___؟"

کیپٹن نے اس لڑکی کو سب سے پہلے بحیرۂ روم کے ساحل پر دیکھا تھا۔ وہ فوج میں نیا نیا لفٹیننٹ بھرتی ہوا تھا۔ اور ملایا اور فلپائن میں کچھ عرصہ جاپانیوں کے مقابل لڑنے کے بعد اپنی رجمنٹ کے ساتھ مشرقِ وسطیٰ کے محاذ پر گیا تھا جہاں اطالوی شمالی لینڈ پر قبضہ کر چکنے پر جرمن فوجیں دومیل کی قیادت میں بن غازی اور طبروق کی سمت بڑھ رہی تھیں۔ ان کا قیام بن غازی میں تھا جہاں اُنھوں نے دو تین مضافاتی جھڑپوں میں ڈیڑھ سو کے قریب اطالوی سپاہیوں کو جنگی قیدی بنا کر رکھا ہوا تھا۔ یہ لوگ اس قدر عیاش تھے کہ اپنے ساتھ عورتیں بھی لے آئے تھے۔ اکثر خندقوں میں حملے کے بعد اطالوی سپاہیوں کے ساتھ نیم عریاں عورتیں بھی مردہ پائی گئیں تھیں، جو سپاہی قید میں تھے وہ سارا دن کھاتے اور گاتے رہتے اور رات کو ناچنا شروع کر دیتے تھے۔ ان میں ہر دوسرا سپاہی سنگتراش یا مصور تھا۔ وہ آبی رنگوں کی خوبصورت تصویریں اور مٹی کے چھوٹے چھوٹے مجسمے بنا کر ان کے عوض چوری چھپے سگریٹ اور شراب حاصل کیا کرتے تھے ان کی طرف دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ وہ لڑائی پر نہیں بلکہ کسی پکنک پارٹی پر آئے ہوئے ہیں۔

بن غازی میں ان کی چھوٹی سی کمپنی تین اطراف سے دشمنوں میں گھری ہوئی تھی چنانچہ رات کو حفاظتی دستے کیمپوں کے ارد گرد سمندر کے کنارے کنارے بندوقیں اور ٹارچیں لے کر گشت لگایا کرتے تھے۔ روم کا سمندر ان کے قریب ہی تھا۔ جس کی نیلی نیلی لہروں کا شور صاف سنائی دیا کرتا تھا۔ اس جگہ ساحل پر ایک طرف دو اطالوی چھوٹے جنگی جہاز اتحادیوں نے اپنے قبضے میں کر رکھے تھے جنہیں مالٹا کے جنوبی پانیوں میں گرفتار کیا تھا۔ یہ جہاز تقریباً خالی تھے اور نصف کے قریب ریت میں دھنسے ہوئے تھے۔ دوسری جانب جرمن اور اطالوی حفاظتی دستے بھی رات کو گشت لگایا کرتے تھے اور کبھی کبھی راستہ بھول کر اس طرف آ نکلتے تھے۔ ہلکی سی جھڑپ کے بعد یا تو وہ بھاگ جاتے تھے اور یا اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کر دیتے تھے۔ لیبیا کے صحراؤں میں رات کے وقت اجنبی ملکوں سے آئے ہوئے سپاہیوں کا راستہ بھول جانا کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ تاہم ایسا

کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔ لفٹیننٹ کو بن غازی میں آئے دو ماہ ہوئے تھے اور اس دو
میں شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہوگا۔ جس دن دشمن نے ان پر بم نہ برسائے ہوں۔ وہ دن
اور رات کا بیشتر حصّہ صحرائی خندقوں میں گزارتے تھے۔ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر ان سے کچھ
میل کے فاصلے پر تھا۔ جہاں سے جنگ کے تمام محاذوں کی تفصیل وار خبریں ان تک
باقاعدہ پہنچتی رہتی تھیں۔ ان کی کمپنی براہ راست بریگیڈ کے ماتحت تھی اور اہم قسم کے
احکامات وہیں سے جاری ہوتے تھے۔ ایک رات آسمان پر گہرے سیاہ بادل ہر سمت چھائے
ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی خنک صحرائی ہوا چل رہی تھی۔ کمپنی کے کمانڈنگ آفیسر میجر گریگوری کی
طرف سے لفٹیننٹ رات کو گشت لگانے والے حفاظتی دستے کا انچارج تھا۔ اندھیرا اس قدر
زیادہ تھا کہ دس قدم کے فاصلے پر کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا
اور ہوا میں کھجور کے درختوں کی شاخیں ڈراونے انداز میں لہرا رہی تھیں۔ لفٹیننٹ اپنے چند
ایک سپاہیوں کی معیت میں رائفلیں، مشین گنیں اور ٹارچیں سنبھالے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے
بالکل خاموشی سے ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ سمندر کی جانب سے آنے
والی لہروں کے دھیمے دھیمے شور کے علاوہ ہر طرف مکمل سکوت تھا اور کوئی آواز سنائی
نہ دیتی تھی۔

اچانک لفٹیننٹ چوکنا ہو کر ٹھٹھک سا گیا۔ اس کے ساتھی بھی کھڑے ہو گئے
اس نے ابھی ابھی ایک آواز سُنی تھی، جیسے کوئی کسی لڑکی کا بوسہ لے رہا ہو۔ وہ تمام
ایک دم زمین پر لیٹ گئے اور انگلیاں رائفلوں کے گھوڑوں پر رکھ دیں۔ اب ایک
نسوانی آواز قہقہے کی آواز آئی، سپاہیوں نے سانس روک لئے۔ "دشمن نے کوئی چال
تو نہیں چلی ۔۔؟" ہر آدمی یہی سوچ رہا تھا۔ لفٹیننٹ ریت پر لیٹا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر
اندھیرے میں اس آواز کا تعاقب کر رہا تھا۔ اب اُنھوں نے ریت پر بہت سے قدموں
کی چاپ سُنی جو بتدریج ان کی سمت بڑھ رہی تھی۔ لفٹیننٹ کے اشارے پر تمام سپاہی
ریت پر پیچھے کی طرف کھسکنے لگے۔ دفعتاً اندھیرے میں سے چند دھندلے سے چہرے نمودار
ہوئے اور نہایت مدھم سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہوئے ان کے قریب سے گزر گئے۔ جب
وہ ان سے چھ سات قدموں کے فاصلے پر جا چکے تو لفٹیننٹ نے زوردار آواز میں "ہالٹ"
کہا۔ اور ان کے چہروں پر ایک ساتھ دس گیارہ ٹارچوں کی تیز روشنی پھینک دی گئی۔

وہ کل سات تھے جن میں چار لڑکیاں تھیں۔ ان میں ہر ایک کے پاس بندوق تھی اور تیز روشنی میں وہ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے تک رہے تھے۔ لفٹیننٹ نے انھیں ہاتھ اوپر اٹھانے اور ہتھیار پھینک دینے کا آرڈر دیا اور ان کی تلاشی لینا شروع کردی۔ ہر سپاہی کی جیب میں پستول اور منہ سے بجانے والا باجہ تھا۔ یہ لوگ اطالوی تھے اور پٹرولنگ کرتے ہوئے راستہ بھول کر اتحادی علاقے میں نکل آئے تھے۔ وہ یوں گرفتار ہو جانے پر بالکل پریشان نہ تھے اور ایک دوسرے کو ہنس ہنس کر مذاق کر رہے تھے۔ چاروں لڑکیاں خاکی وردی میں ملبوس تھیں اور ٹارچ کی تیز روشنی میں کشتی نما ٹوپیوں کے نیچے ان کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ایک لڑکی کے بال گہرے سرخ تھے اور وہ ان سب سے الگ الگ سی کھڑی تھی۔ لفٹیننٹ نے انھیں دو قطاروں میں کھڑا کر کے چلنے کا حکم دیا اور تھوڑی دیر بعد کمپنی کے کیمپ میں لے آیا۔ راستے میں ہر لڑکی کسی نہ کسی سپاہی کا منہ چوم رہی تھی اور اپنی زبان میں یا تو اُسے گالیاں دے رہی تھی یا پیار سے مخاطب کر رہی تھی۔ لیکن اس نے دیکھا کہ سرخ بالوں والی تپلی دُبلی لمبی سی لڑکی نہ کسی سے مذاق کرتی اور نہ کسی کا منہ چوم رہی تھی بلکہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے بڑے متوازن قدم اُٹھاتی ریت پر چپ چاپ چلی جا رہی تھی۔

کیمپ پہنچ کر لفٹیننٹ نے سب سے پہلے گارڈ کمانڈر کو رپورٹ کی جس نے اسی وقت ڈیوٹی افسر کو اطلاع کر دی۔ ڈیوٹی آفیسر جنوبی افریقہ کا ایک حبشی تھا جس نے ہندوستانی فوج میں رہ کر لڑنے کے عہد نامے پر دستخط کئے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے بیڈ روم ہی سے کہلوا بھیجا کہ قیدیوں کو گارڈ روم میں بند کر دیا جائے۔ چنانچہ لفٹیننٹ نے ان اطالوی سپاہیوں اور لڑکیوں کو گارڈ روم کے کمرے میں بند کر دیا۔ صبح سے پہلے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو جو خبر پہنچی وہ یہ تھی کہ رات سمندر کے کنارے دشمن کے کچھ سپاہی گولیاں ضائع کئے بغیر قیدی بنا لئے گئے۔ ہیڈ کوارٹر سے دن کی روشنی نکلتے ہی دو آفیسر جیپ پر سوار ہو کر وہاں پہنچ گئے۔ ان میں ایک کپتان تھا اور ایک سارجنٹ۔ یہ دونوں برطانوی تھے اور سگریٹ پی رہے تھے۔ اُنھوں نے لفٹیننٹ کی معیت میں گارڈ روم میں قیدیوں کا معائنہ کیا اور لفٹیننٹ نے دیکھا کہ سرخ بالوں والی لڑکی کے علاوہ ہر لڑکی کسی نہ کسی اطالوی سپاہی کی آغوش میں سوئی ہوئی تھی۔ یہ لڑکی ایک کونے میں دبکی پڑی تھی اور اس کے چہرے پر رات بھر جاگنے سے تھکن اور پژمردگی کے اثرات تھے۔ صبح کی روشنی میں لفٹیننٹ نے یہ بھی دیکھا کہ اس

لڑکی کی آنکھیں نیلی ہیں اور ہونٹ بڑے نازک اور باریک ہیں۔ جیسے کسی ماہر سنگتراش نے مہینوں کی عرق ریزی کے بعد تراشے ہوں۔ اس کے چہرے پر بچوں ایسا لاابالی بھولپن اور پختہ عمر کی عورتوں ایسا استقلال جھلک رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی کالج میں اخلاقیات پر لیکچر دیتے ہوئے اچانک تھرڈ کلاس ٹیکسی ڈرائیوروں کے درمیان پہنچ گئی ہے اور اس انقلاب پر حیران بھی ہو رہی ہے اور اسے برداشت کرنے کی بھی کوشش کر رہی ہے۔ ہیڈ کوارٹر سے آئے ہوئے دونوں افسروں نے بھی اس لڑکی کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اس کی علیحدہ سی شخصیت سے کچھ متاثر بھی ہوئے۔ اس دوران میں باقی قیدی سپاہی اور لڑکیاں جاگ اٹھی تھیں اور انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کرتے اور لباس درست کرتے ہوئے کچھ نفرت اور کچھ غصے کا اظہار کر رہی تھیں۔ ان سبھوں کی تلاشی لی گئی اور رجسٹر میں ان کے ناموں کے علاوہ ان کی جیبوں سے برآمد کی ہوئی چیزوں کو بھی درج کیا گیا۔ سُرخ بالوں والی لڑکی سے جب نام پوچھا گیا تو اس نے نیلی آنکھوں والی بڑی بڑی پلکیں اٹھا کر برطانوی افسروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خالص اطالوی لہجے اور صاف انگریزی میں کہا:۔

"لینورے ـــــ لینورے ایمیل۔"

لفٹیننٹ جب لڑکیوں کے نام رجسٹر میں لکھنے لگا تو برطانوی آفیسرز میں سے کیپٹن واکر اسے ایک طرف لے گیا۔ اور آہستہ سے کہنے لگا:۔

"ہیڈ کوارٹر کو صرف ایک لڑکی کی رپورٹ کرو۔ اس طرح تین لڑکیاں بچیں گی۔ دو ہم لے جائیں گے اور ایک تم پسند کر لینا ــ"

لفٹیننٹ کو کیپٹن واکر کی اس ذلیل تجویز پر اس قدر غصہ آیا کہ اس کے کان سرخ ہو گئے۔ اس نے کیپٹن واکر کی بھوسلے رنگ کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں گندگی اور عفونت کے بے شمار ڈھیر دیکھے اور اس نے نفرت سے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا:۔

"کیپٹن واکر میں نے سات اطالوی گرفتار کئے ہیں اور ہیڈ کوارٹر کو سات قیدیوں کی رپورٹ ملے گی ـ"

کیپٹن واکر نے آنکھیں ذرا سی بند کر کے بڑی حقارت سے لفٹیننٹ کو دیکھا۔ اور سگریٹ پاؤں تلے مسل کر اپنے ساتھی افسر سمیت باہر نکل گیا۔ ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ اسی روز پہنچی تھی۔ لیکن کمپنی کمانڈنگ آفیسر میجر گریگوری نے اسے روک دیا۔ اس نے لفٹیننٹ کو بلا کر کہا

کہا کہ وہ باقی لڑکیوں کو شمار کرے لیکن نیلی آنکھوں والی لڑکی کا نام درج نہ کرے کیونکہ وہ اسے اپنے دفتر میں اپنی سٹینو بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ لفٹیننٹ مجبور ہو گیا۔ نیلی آنکھوں اور سرخ بالوں والی لڑکی کو جب وہ اس فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ غصے میں بپھر گئی۔

"یہ کبھی نہیں ہوگا۔ میں جنگی قیدی ہوں اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہوں گی۔"

لفٹیننٹ خاموشی سے ایک طرف کھڑا اس کے چہرے پہ جذبات کا اتار چڑھاؤ دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے کا زرد اور سپید رنگ غصے میں ہلکا گلابی سا ہو رہا تھا اور اس کی نیلی آنکھوں مین آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ جب کے ساتھیوں نے اسے اس بات پر بہت مجبور کیا کہ وہ آرام دہ اور آسان زندگی کی اس پیش کش کو قبول کر لے تو وہ دونوں بازوؤں میں منہ چھپا کر بے اختیار رونے اور سسکیاں بھرنے لگی۔ لفٹیننٹ نے گارڈ کمانڈر کو کچھ کہا اور باہر نکل آیا۔

دوسرے دن لینورے دفتر میں آگئی اور باقی قیدیوں کو بڑے کیمپ میں روانہ کر دیا گیا۔ بن غازی میں سیکڑوں اطالوی شہری رہ رہے تھے چنانچہ لینورے کو بڑی آسانی سے بن غازی کا باشندہ ظاہر کر کے دفتر میں ملازم رکھ لیا گیا۔ میجر گریگوری نے پہلے پہل لینورے کو کمرے میں ہی میز کرسی رکھوا دی لیکن کچھ دنوں بعد لینورے نے ٹائپ کر کے درخواست لکھی کہ اسے میجر کے کمرے سے باہر عام دفتر میں جگہ دی جائے۔ اس کی وجہ اس نے یہ بتلائی کہ میجر کا کمرہ چھوٹا ہے اور اسے ہر وقت زکام رہتا ہے۔ میجر گریگوری نے پہلے تو انکار کر دیا لیکن جب لینورے نے ہیڈ کوارٹر میں عرضی بھیجنے کی دھمکی دی تو میجر نے مجبوراً ہتھیار پھینک دیئے۔ بعد ازاں لینورے نے لفٹیننٹ کو بتایا کہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ میجر دفتری خطوط لکھواتے وقت اس کے شانوں اور رخساروں پر ہاتھ پھیرا کرتا تھا۔

اب جو میز لینورے کو ملی وہ لفٹیننٹ کے بالکل ساتھ والی تھی۔ دفتر کا اسٹاپ میجر گریگوری کے علاوہ کیپٹن بیٹس، سارجنٹ میکائے اور ایک بنگالی جمعدار ماہر پر منحصر تھا۔ ایک روز اچانک کیپٹن بیٹس کی تبدیلی کا حکم آگیا۔ اُسے طبروق منتقل کر دیا گیا اور اس کی جگہ ہیڈ کوارٹر سے کیپٹن واکر نے آکر چارج لے لیا۔ یہ سب کچھ ایک طے شدہ پروگرام کے تحت ہوا تھا اور لفٹیننٹ کو اپنے آپ اس نیلی آنکھوں اور سرخ بالوں والی بھولی بھالی اطالوی دوشیزہ سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ

جب تک بن غازی میں ہے لینورے کو ہر قسم کی مصیبت سے بچائے رکھے گا۔ کیپٹن واکر نے آتے ہی میجر سے مل کر لینورے پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ اس کی چھوٹی سی چھوٹی ضرورت کا بھی خیال رکھا جانے لگا۔ صبح اگر کیپٹن واکر لینورے کے کوارٹر میں اردلی کے ہاتھ نیلے انگور اور لالہ کے سرخ پھول بھجوا رہا ہے تو شام کو میجر گریگوری خرطوم اور فلسطین کی پرانی شراب کی خوبصورت بوتلیں پیش کر رہا ہے۔ لینورے نیلے انگور ملازمین میں بانٹ دیتی، سرخ پھول کارنس پر رکھ دیتی اور فلسطینی شراب کی بوتلیں واپس کر دیتی اس لئے کہ اسے شراب کی عادت نہیں تھی۔ اسے شراب سے نفرت تھی۔ ہر ملک کی شراب سے اور میجر گریگوری اور کیپٹن واکر سے نفرت تھی۔ وہ اپنے آپ کو زرد دانتوں اور ضعیف ٹانگوں والے شکاری کتوں میں گھرا ہوا محسوس کرنے لگی تھی اور وہاں سے کسی نہ کسی طرح بھاگ جانے کے متعلق سوچ رہی تھی۔

کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ ان ریتلے صحراؤں اور گندگی کے تاریک ڈھیروں سے نکل کر اٹلی پہنچ جائے، فلورنس پہنچ جائے، اپنے گاؤں کی تازہ اور کھلی ہواؤں میں بازو پھیلا کر کھڑی ہو جائے۔ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھے قدم قدم چلتی اس پتھریلی پگ ڈنڈی پر سے گزر جائے۔ جس کے اوپر انگور کے بیلوں کی چھت پڑی ہوئی ہے۔ وہ اپنے گھر کے احاطے کے باہر سپیدے کے درخت کی اوٹ میں کھڑی ہو کر اپنی بوڑھی ماں کو سر پہ نیلا رومال باندھے بھینسوں کا دودھ دوہتے یا بھیڑوں کی اون کو دھوپ میں چھانٹتے دیکھے۔ دوسری طرف اس کی چھوٹی بہن میریا باورچی خانے کے پچھواڑے اُگے ہوئے آلوچے کے درخت تلے بیٹھی اُبلے ہوئے آلو چھیل رہی ہو اور پھر ایک طرف سے اس کی جھکی ہوئی بھنوؤں والا بوڑھا باپ نمودار ہو۔ اس کی پرانی پتلون گھٹنوں سے باہر نکلی ہوئی ہو۔ پاؤں میں اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے چمڑے کے فل بوٹ ہوں۔ خاکی رنگ کی میلی جرسی آستینوں تک چڑھی ہوئی ہو۔ سر پہ پیچھے کی طرف ڈھلکی ہوئی بھدی اونی ٹوپی ہو اور زرد مونچھوں کے نیچے ہونٹوں میں بجھا ہوا گھر یلو سگار ہو۔ وہ منہ ہی منہ میں حسب عادت بڑبڑاتا باورچی خانے کی طرف جائے۔ میریا کو آلو چھیلتے دیکھ کر آہستہ سے سر ہلائے اور دیوار کے ساتھ لگا ہوا بیلچہ اُٹھا کر انگور کے باغ میں داخل ہو جائے۔

سپیدے کے درخت کی اوٹ میں کھڑی لینورے یہ سب کچھ دیکھے اور پھر ایکدم بھاگ کر سامنے نکل آئے اور اپنی بوڑھی ماں کے گلے لگ جائے اور اس کی گود میں سر رکھ کر بے اختیار رونا شروع کر دے۔ لیکن بن غازی سے اطالیہ بہت دور تھا اور فلورنس پر دشمن کے طیارے بم

برسارہے تھے اور اس کے گاؤں کی پگڈنڈیاں ویران تھیں اور انگور کے باغات اُجڑ گئے تھے، اور اب میجر گریگوری چٹھیاں لکھواتے وقت اس کے شانوں پر ہاتھ پھیرتا تھا اور کیپٹن واکر اسے نیلے انگور اور لالہ کے پھول بھیجا کرتا تھا اور وہ ان دونوں کے درمیان معصوم خرگوش کی مانند سہمی بیٹھی تھی۔

محاذ جنگ پر عہدوں کا بہت کم خیال رکھا جاتا ہے اور دشمن پر حملہ آور ہوتے ہوئے تو کندھوں اور بازوؤں پر سے تمام امتیازی نشانات نوچ کر پھینک دیئے جاتے ہیں۔ بن غازی کے قرب وجوار میں اس وقت گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔ جرمن فوجیں رومیل کی قیادت میں کئی اطراف سے طبروق العالمین کی جانب بڑھنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھیں۔ چنانچہ دفتر کا سارا اسٹاپ پانچ سات کمروں والے کوارٹروں کی ایک چھوٹی سی قطار میں رہتا تھا۔ میجر گریگوری پہلے کوارٹر میں مقیم تھا۔ کیپٹن واکر دوسرے، لینورے نمبر ۳ میں رہتی تھی۔ لفٹیننٹ کا کوارٹر چوتھے نمبر پر تھا اور لفٹیننٹ کے بعد جمعداروں اور حوالدار کلرکوں کے دو تین کمرے تھے۔ لینورے عام طور پر دفتر سے نکل کر سیدھی اپنے کمرے میں آجاتی تھی اور کتابوں کے مطالعے میں منہمک رہتی تھی۔ وہ صرف اتوار کے روز گرجا گھر میں صبح کی نماز سے فارغ ہو کر شہر میں ضروریات کی چند ایک چیزیں خریدنے جاتی اور واپس آکر اپنے آپ کو کمرے میں بند کر دیتی۔ دفتر میں اس کی زیادہ بات چیت کسی سے بھی نہیں تھی۔ گریگوری اور واکر سے اسے ویسے ہی نفرت تھی اور کلرکوں وغیرہ سے تعلقات بڑھانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لفٹیننٹ سے اس کی گفتگو دفتری امور تک ہی محدود تھی اور نہ اس نے کبھی حد سے آگے بڑھنے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ سارجنٹ میکائے دبلا پتلا منحنی سا انگریز لڑکا تھا جو ہر وقت اپنی دُھن میں ہی مگن رہتا تھا۔ وہ عام طور پر کام میں مصروف رہتا تھا۔ اور فرصت کے اوقات میں اپنے گھر لمبے لمبے خط لکھا کرتا تھا۔ لفٹیننٹ نے لینورے کو کبھی مسکراتے نہیں دیکھا تھا اور وہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ جب وہ مسکراتی ہوگی تو اس کا معصوم چہرہ پہلے سے کتنا خوبصورت ہو جاتا ہوگا۔ اگرچہ لینورے کی میز اس کے ساتھ ہی تھی تاہم ان دونوں میزوں کے درمیان ردم کا سمندر رحائل تھا۔

ایک شام جب کہ آسمان پر نیلا صحرائی چاند چمک رہا تھا کیپٹن واکر شراب پی کر لینورے کے کمرے کے باہر آکھڑا ہو گیا اور زور زور سے دروازے پر مکّے مارنے لگا۔ اس کی آوازیں سُن کر لفٹیننٹ اپنے کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ لینورے نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے دروازے

کو اندر سے مقفل کر لیا تھا۔ اور غالباً پلنگ پر سہمی بیٹھی تھی۔ کیپٹن شراب کے نشے میں دھت تھا اور اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ وہ پاگلوں کی طرح دروازے پر دستکیں دے رہا تھا اور لینورے کو چیخ چیخ کر ڈیولز ڈریم اور رینکیز میول ایسے احمقانہ ناموں سے پکار رہا تھا۔ اچانک وہ لڑکھڑایا اور دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ اس دوران میں کلرکوں کے علاوہ میجر گریگوری بھی اپنے کوارٹر سے باہر نکل آیا تھا۔ انھوں نے کیپٹن واکر کو اٹھا کر بصد مشکل اس کے کمرے تک پہنچایا اور میجر گریگوری نے باہر سے زنجیر چڑھادی۔ دوسرے روز میجر گریگوری نے لینورے کے سامنے کیپٹن واکر کو سخت سست کہا جس پر وہ ناک بھوں چڑھاتا اس کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ میجر گریگوری لینورے پر اپنی شرافت اور فرض شناسی کا رعب جمانا چاہتا تھا۔ ویسے بھی کیپٹن واکر کے ہوتے ہوئے اسے اپنی دال گلتی کچھ مشکل نظر آرہی تھی۔ چنانچہ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے کیا داؤں استعمال کیا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر کیپٹن واکر کی تبدیلی کے احکامات آگئے۔ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر نے اُسے قاہرہ منتقل ہونے کا حکم دیا تھا۔

میجر گریگوری کے سامنے اب میدان بالکل صاف تھا۔ چنانچہ لینورے کو بات بات پر اپنے کمرے میں بلانے لگا۔ ایک دن اسے اپنے یہاں شام کے کھانے کی دعوت دی گئی جسے لینورے نے نہایت سادگی سے ٹال دیا۔ میجر کو مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔ وہ اس سے پیشتر لینورے پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کر چکا تھا کہ وہ اس اطالوی دوشیزہ سے ازحد ہمدردی رکھتا ہے۔ لیکن لینورے کا طرزِ عمل اس کی توقعات کا برعکس تھا۔ وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا اور آخر ایک دن یہ جوالا مکھی بھی پھٹ پڑا۔

وہ رات سائیرینیکا کے ریگ زاروں پر بڑے پُراسرار انداز میں طلوع ہوئی تھی۔ دن کو دو تین بار دشمن کے طیارے بم گرا چکے تھے اور رات کو کافی خنکی ہو گئی تھی۔ بحیرہ روم کی جانب سے ہوا چل رہی تھی، جو نم آلود تھی اور جس میں نمکین اور کھاری بو بھی تھی۔ لفٹیننٹ کچھ گھریلو خطوط لکھنے کے بعد بتی بجھا کر ابھی لیٹا ہی تھا کہ اسے ساتھ والے کمرے میں لینورے کے زور سے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ وہ ایک دم بستر پر سے اچھل پڑا اور بجلی ایسی تیزی کے ساتھ لینورے کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر جو منظر اس نے دیکھا وہ اس کی برداشت سے باہر تھا میجر گریگوری شراب کے نشے میں چور، لینورے کو زمین پر گرائے ہوئے تھا اور اس کے سینے پر سوار خچر کی طرح ہانپ رہا تھا۔ لفٹیننٹ نے جلدی سے دھکا دے کر میجر کو پرے گرا دیا اور لینورے کو اٹھا کر

ایک طرف کھینچ لیا۔ غریب لڑکی کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور شب خوابی کا لباس داہنی طرف سے آستین تک پھٹا ہوا تھا۔ میجر گریگوری نے پلنگ کا سہارا لے کر جھکتے جھکتے قہر آلود سرخ سرخ آنکھوں سے لفٹیننٹ کو دیکھا اور بھیڑیے کی طرح چیخا۔

" میں تمہیں کوارٹر گارڈ میں بند کر دوں گا ——— یو ڈرٹی سوائین سٹوپڈ فول ——— "

لفٹیننٹ نے میجر گریگوری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے تحمّل سے کہا۔

" میجر تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ میرے ذرا سی زبان کھولنے پر تمہارا سارا فوجی مستقبل تباہ ہو سکتا ہے۔ کیمپ میں لیٹے ہوئے اطالوی قیدی اس کے گواہ ہیں کہ تم نے اور کیپٹن واکر نے ایک اطالوی لڑکی کو اپنی مرضی سے بن غازی کی رہنے والی ظاہر کر کے اپنے دفتر میں ہی رکھا ہے۔ صبح اگر میرا کورٹ مارشل ہو گا تو پرسوں تمہارے کندھے سے بھی سنہری تاج نوچ لیا جائے گا

میجر گریگوری جیسے یکا یکی ہوش میں آ گیا۔ اس نے جیب سے خاکی رومال نکال کر ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھا اور پاؤں سے کرسی کو زور سے ٹھوکر مار کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ لینورے نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا اور پلنگ کی پٹی پر سر رکھ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

" روؤ مت لینورے ——— تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ خدا نے عین وقت پر تمہاری حفاظت کی ——— "

لینورے کچھ دیر سسکیاں بھرنے کے بعد تھرائی ہوئی آواز میں بولی: ———

" آپ کا شکریہ جناب ..... بہت بہت شکریہ ——— آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

" یہ میرا فرض تھا۔ تمہاری جگہ خواہ کوئی اور لڑکی کیوں نہ ہوتی، چیخ کی آواز سن کر میں اپنے کمرے میں نہیں رہ سکتا تھا۔ لو اب آرام سے سو جاؤ۔ صبح جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا ——— اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ صبح کچھ نہ ہو گا ——— "

لینورے نے آہستہ سے اپنا افسردہ چہرہ اٹھا کر لفٹیننٹ کو دیکھا۔ اس کی نیلی نیلی آنکھوں

میں آنسو اور احسان مندانہ چمک تھی۔ اس نے سپید ہاتھوں کی اداس حرکت سے سر کے سرخ
بالوں کو سیاہ فیتے میں باندھا اور پلنگ پر دراز ہو کر کمبل اوڑھ لیا۔
" جناب میں آپ کا احسان عمر بھر نہیں بھولوں گی "
لفٹیننٹ نے گری ہوئی کرسی اُٹھا کر میز کے ساتھ لگائی۔ دھیمی آواز میں شب بخیر
کہا اور دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ لینورے نے اُٹھ کر دروازہ اندر سے اچھی طرح
بند کیا اور بتی بجھائی اور بستر پر لیٹ کر دیر تک اپنی نیک دل ماں اور بہن بھائیوں کو یاد کر کے
تکیئے پر آنسو بہاتی رہی۔
اگلی صبح لینورے دفتر جانے کی بجائے لفٹیننٹ کے کمرے میں آ گئی۔ دن ابھی ابھی نکلا
تھا اور سورج کی ترچھی کرنیں کھجور کے جھنڈوں کے اوپر سے ہو کر گزر رہی تھیں۔ لفٹیننٹ بستر
ہی میں تھا اور اردلی چائے لئے لئے پانی رکھ کر جوتے پالش کر رہا تھا۔ لینورے نے اندر داخل
ہوتے ہی صبح بخیر کہا اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ آج اس کا چہرہ پہلے سے کچھ
اترا ہوا تھا اور آنکھیں یوں بوجھل سی لگ رہی تھیں جیسے وہ تمام رات جاگتی رہی ہو۔
لفٹیننٹ بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔
" یہاں آ جاؤ لینورے ——— آج سورج بڑا چمکیلا ہے۔ یہاں بیٹھ جاؤ "
لینورے ہلکے پھلکے قدم اُٹھاتی پلنگ کے قریب والی کرسی پر بیٹھ گئی۔
" چائے پیو گی ؟ "
" شکریہ ! میں پی کر آئی ہوں "
کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔ لفٹیننٹ سگریٹ نکال کر سلگانے لگا اور لینورے
نظریں جھکائے چپ چاپ بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی۔ لفٹیننٹ نے لینورے کی
پیالی بناتے ہوئے کہا:۔
" رات جو کچھ ہوا مجھے ذاتی طور پر اس کا افسوس ہے اور میں دنیا کے تمام
شریف النفس مردوں کی طرف سے اس کی معافی مانگتا ہوں۔ زندگی
میں ایسے ناخوشگوار حادثات ہوتے ہی رہتے ہیں اور خاص طور سے
جب انسان پردیس میں ہو تو ان میں اضافہ ہو جاتا ہے ——— بہرحال
زندگی بسر کرنا ایک آرٹ ہے اور وہ لوگ جو اس آرٹ سے واقف

ہیں وہ اپنی عزت کرتے ہیں۔ ہے وہ کسی بھی حالت میں کیوں نہ ہوں ــ میرا مطلب ہے خواہ وہ دشمن کی قید میں پڑے ہوں اور خواہ وہ اپنے گھر کے باورچی خانے میں بیٹھے ہوں ــــ چینی کتنی ڈالوں ــ ؟"

لینورے نے آہستہ سے کہا:ــ "دو چمچ ــ"

وہ دونوں خاموشی اور سکون سے چائے پیتے رہے۔ برآمدے میں اردلی برش سے وردی صاف کر رہا تھا اور کھڑکی پر اس کا سایہ بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا کیمپ کی جانب سے سپاہیوں کے گارد بدلنے اور پریڈ کرنے کی دھیمی دھیمی آوازیں آرہی تھیں۔ لینورے نے پیالی میز پر رکھتے ہوئے لفٹیننٹ کی طرف دیکھا اور بجھی بجھی سی آواز میں کہا:۔

" رات آپ نے میری عزت بچائی ہے عورت ــــ وہ فلورنس کی رہنے والی ہو یا بن غازی کی، اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ اس وقت آپ کے پاس ایک اور احسان کی درخواست لے کر آئی ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ مجھے ناامید نہ ہونے دیں گے۔"

لفٹیننٹ نے سگریٹ راکھدان میں بجھا دیا ــــ "تمہارے دل میں جو کچھ ہے، مجھے کہدو لینورے ــــ ! اگر ہوسکا تو میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا ــــ"

لینورے ایک لحظہ کے لئے خاموش ہوگئی اور آنکھیں جھکائے کچھ سوچتی رہی۔ پھر جیسے اپنے آپ بول اُٹھی :ــ

"میں اس دفتر کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنا چاہتی ہوں ـ"

لفٹیننٹ ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"یعنی ــــ تمہارا مطلب ہے کہ تم ملازمت چھوڑ دینا چاہتی ہو؟"

"ہاں ــــ"

"لیکن لینورے ــــ یہ جنگ کا زمانہ ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میجر کو تمہارا استعفیٰ نامنظور کرنے کا پورا حق حاصل ہے اور اگر اس نے منظور کر بھی لیا تو تم کیا کروگی ــ ؟ کہاں جاؤگی، پورا لیبیا عجیب افراتفری کی حالت میں ہے۔"

"کچھ بھی ہو میں اب اس فوجی ماحول میں نہیں رہ سکتی۔ مجھے اس چاردیواری سے خوف آنے لگا ہے۔ میں اگر نہ گئی تو خودکشی کر لوں گی اور میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ میرے دو چھوٹے بھائی فلورنس میں پڑھ رہے ہیں اور پھر ان کے بورڈنگ کے اخراجات کون اُٹھائے گا ——؟ میں نہیں چاہتی کہ وہ شہر کی گلیوں میں اخبار بیچیں اور رات کو مال گاڑیوں کے ڈبّے میں سوئیں۔

اور پھر ایک بار اپنے گاؤں، اپنے گھر ضرور جانا چاہتی ہوں۔ وہاں میری ماں، میری بہن میریا اور میرا بوڑھا باپ میرا انتظار کر رہے ہیں۔ اور آلوچے کا وہ چھوٹا سا پودا بھی جسے میں نے آتی دفعہ باورچی خانے کے عقب میں لگایا تھا۔ وہ اب کافی اونچا ہو گیا ہوگا اور کیا عجب ہے کہ اب کی بہار میں اس کی ٹہنیوں پر پھول آجائیں ——"

لفٹیننٹ نے لینورے کو اس سے بیشتر اتنی دیر بولتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ جلتا ہوا سگریٹ انگلیوں میں دبائے بڑی توجہ سے اس عورت کی باتیں سُن رہا تھا جو ہر عورت کے اندر موجود ہوتی ہے اور جسے زندگی گزارنے کے لئے صرف ایک باورچی خانے اور اس کے سامنے لگے ہوئے درخت کی ضرورت ہے۔ جس کی وہ اپنے ہاتھوں سے آبیاری کرے اور اس کی پھل دار شاخوں کے سائے میں بیٹھ کر اپنے ماضی کے نشیب و فراز گن سکے۔ لینورے خاموش ہو گئی تھی، اور اس کی جھکی ہوئی لانبی پلکوں پلکوں پر بیتی ہوئی صبحوں کی شبنم تھرتھرا رہی تھی۔ لفٹیننٹ نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے اس خاموشی کو توڑا۔

"اگر ایسی بات ہے تو میں تمہاری ہر ممکن امداد کرنے کے لئے تیار ہوں لینورے۔ لیکن مجھے امید نہیں کہ میجر گریگوری تمہارا استعفےٰ منظور کرے گا ——"

"آپ فکر نہ کریں، اگر اس نے انکار کر دیا تو میں اسے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے سامنے اپنے اطالوی قیدی ہونے کا پول کھول دینے کی دھمکی دوں گی —— پھر اس کے علاوہ میں ڈاکٹری سرٹیفکیٹ بھی تو پیش کرنا چاہتی ہوں —— میری صحت خراب رہنے لگی ہے۔ مجھے پردیس کی کوئی چیز موافق نہیں آئی ——"

اردلی بوٹ اور وردی لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ لفٹیننٹ نے گھڑی دیکھی، دفتر کا وقت ہو رہا تھا۔

"اب تم اپنے کمرے میں آرام کرو لینورے ـــ میں اس مسئلے کو کامیابی سے حل کرنے کی کوشش کروں گا ـــ"

دوسرے دن لینورے نے میجر گرگوری کی میز پر اپنا استعفیٰ رکھ دیا۔ ـــ میجر اس بات کے لئے قطعی تیار نہیں تھا۔ استعفے کے ساتھ ہی فوجی ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ بھی تھا۔ جس میں لینورے کی صحت کو کمزور بتایا گیا تھا۔ اس کے باوجود میجر گرگوری نے اسے منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

"ان حالات میں تم نوکری نہیں چھوڑ سکتیں ـــ"

"لیکن میری صحت خراب ہے جناب ـــ میں کام نہیں کر سکتی"

"ہم یہاں صحتیں بنانے نہیں آئے، کام کرنے آئے ہیں ـــ"

"لیکن جناب آپ کو استعفیٰ منظور کرنا پڑے گا ـــ"

"اور اگر میں انکار کر دوں تو ـــ؟"

"تو ـــ!"

لینورے ذرا رکی۔ اچانک اس کی نیلی آنکھوں میں بجلی سی چمکی اور اس نے دھیمے لہجے میں کہا:-

"تو مجھے مجبوراً ہیڈ کوارٹر کو لکھنا پڑے گا کہ میں قیدیوں کے کیمپ میں اپنے ساتھیوں کے پاس جانا چاہتی ہوں ـــ"

میجر گرگوری کے بھنچے ہوئے لب ذرا سے ڈھیلے ہو گئے اور وہ خاکی ٹائی کی گرہ درست کرنے لگے۔

"اگر تم اپنا نقصان ہی چاہتی ہو تو میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا ـــ"

اسی دن لینورے نے لفٹیننٹ کو بتایا کہ اس کا استعفیٰ منظور ہو گیا ہے اور وہ اب آزاد ہے وہ اپنا مختصر سا سامان ایک سوٹ کیس میں بند کر کے شہر لے گئی، جہاں کسی اطالوی ہوٹل کے مالک کی بیٹی کو اس نے اپنی سہیلی بنا رکھا تھا، وہ اسی سہیلی کے گھر جا کر ٹھہر گئی۔ دوسرے دن شام کے وقت وہ لفٹیننٹ سے ملنے آئی۔ اس نے ہلکے

براؤن رنگ کا سایہ پہنا ہوا تھا اور گردن پر نصف کے قریب سرخ بال نیلے اور سپید پھول دار رومال سے باندھ رکھے تھے۔ اس لباس میں لفٹیننٹ اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا اور لینورے اسے پہلے سے زیادہ دلکش اور معصوم نظر آ رہی تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں شفاف اور پاکیزہ چمک تھی اور چہرے پر بہار کے پہلے پھول ایسی تازگی اور نکھار تھا۔

"شام بخیر جناب —! مجھے جلدی آجانا تھا لیکن میری سہیلی لیزا نے مجھے باتوں میں لگائے رکھا۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ جس لڑکے سے اس کی بات پکّی ہوئی تھی وہ نیپلز میں رہتا تھا اور آج کل مسولینی کی فوج میں اتحادیوں کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے وہ کہہ رہی تھی کہ اتحادیوں کو مشرق وسطیٰ میں ضرور شکست ہوگی اور انھیں سائرنیکا سے بھاگنا پڑے گا۔ اس کا خیال ہے وہ بن غازی ہی میں اپنے منگیتر کا انتظار کرے گی — بے چاری اس سے بڑی محبت کرتی ہے —"

"بہت خوب — گویا وہ ہمیں یہاں سے نکالنے کے خواب دیکھ رہی ہے"

لینورے ہنس پڑی —

"نہیں ایسا نہیں —"

اور لفٹیننٹ نے دیکھا کہ اس کے دانت بڑے ہموار اور چمکیلے تھے اور اس کی مسکراہٹ میں آلوچے کے پھولوں ایسی شگفتگی اور سادگی تھی اور اس نے سوچا کہ لینورے کے گھر میں باورچی خانے کے عقب میں لگے ہوئے آلوچے کے درخت پر ضرور پھول آگئے ہوں گے۔ چائے انھوں نے ملکر پی۔ لینورے نے بتایا کہ وہ اسی ہوٹل میں عنقریب ہی ملازم ہو جائے گی جس کے مالک کی لڑکی اس کی سہیلی ہے۔ اور جن کے یہاں آجکل وہ ٹھہری ہوئی ہے۔

"لیزا تو بہت اچھی لڑکی ہے مگر اُس کا موٹا باپ بڑا یہودی ہے۔ جب اس نے اپنے باپ کو میری نوکری کے لئے کہا تو وہ مان تو گیا لیکن ساتھ ہی کہنے لگا کہ میری ضمانت کون دے گا۔ جنگ کا زمانہ ہے۔ کیا خبر یہ لڑکی کوئی مصیبت لے آئے — سچ مجھے تو اس کی یہ بات بڑی بُری لگی ہے۔ بھلا ہم چہرہ دیکھ کر کسی کے دل کا اندازہ نہیں کر سکتے —؟"

لفٹیننٹ ہنس پڑا —!

"چہرے اکثر دھوکا دے جاتے ہیں۔ اور پھر برائی تو عام طور پر خوبصورت ہوتی ہے"،
لینورے جھٹ بول اٹھی ——

"غلط —— بالکل غلط۔ برائی کبھی خوبصورت نہیں ہوسکتی۔ اگر ایسا ہوتا تو مونا لیزا کی مسکراہٹ اور ریفائل کا کوئی شہکار زندہ نہ رہتا اور لینارڈو کا کوئی مجسمہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہوسکتا ——"

لفٹیننٹ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا

"آخر اطالوی ہو۔ خوبصورتی کی توہین برداشت نہیں ہوسکی ——"

لینورے بھی ہنس پڑی اور آلوچے کے پھول دھوپ میں چمکنے لگے۔ اب باہر ریت کے ٹیلوں تلے شام کا ہلکا ہلکا ٹھنڈا اندھیرا پھیلنے لگا۔ اور سمندر کی جانب سے آنے والی ہوا زیادہ تیز ہوگئی تھی۔ لینورے چلنے کے لئے تیار ہوگئی۔

"میں اب جاتی ہوں —— لیکن پرسوں اتوار کے روز آپ کو ہمارے یہاں ضرور آنا ہوگا۔ آپ کھانا بھی ہمارے یہاں کھائیں گے اور لیزا بھی آپ سے ملنا چاہتی ہے اور وہ آپ کو پیانو بھی سنائے گی ——"

"میں کوشش کروں گا ——"

"کوشش نہیں —— آپ کو آنا ہوگا۔ مکان کا تو آپ کو علم ہی ہے اچھا —— شب بخیر ——"

لینورے دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ برآمدے کے فرش پر اس کے سینڈل کی ٹک ٹک کچھ سکنڈ کے لئے بلند ہوئی اور پھر ڈوب گئی۔

اتوار کا سارا دن لفٹیننٹ نے لیزا کے یہاں گزارا۔ اس نے کھانا بھی وہاں کھایا۔ تلخ مصری کافی اور اطالوی تمباکو بھی پیا اور لیزا سے پیانو پر قدیم اطالوی اور جرمن موسیقاروں کو بھی سنا۔ لیزا میانے قد کی موٹی سی قبول صورت لڑکی تھی۔ جس کے بال چمکدار اور سونے کے رنگ ایسے زردی مائل بھورے تھے۔ اس کی ناک یونانیوں کی طرح لمبی اور آگے سے ذرا سا اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ سینہ ابھرا ابھرا تھا اور جب وہ ہنستی تھی تو اس کے پرسکون چہرے پر خوشحالی اور تن پروری کا احساس جھلکتا تھا۔ لفٹیننٹ سے اس نے بڑی کاہلی سے اپنا گول مٹول سا ہاتھ ملایا اور کہا:

"لینورے آپ کی بہت تعریف کیا کرتی تھی۔ آپ سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا۔"

اس کی آواز بھاری اور کرخت تھی۔ وہ یوں بول رہی تھی جیسے سو کر اُٹھی ہو۔

لیزا کے باپ کا مکان ہوٹل کی دوسری منزل پر تھا۔ یہ چھ سات کھلے اور ہوا دار کمروں پر مشتمل تھا جو ایک مربع کی شکل میں ایک دوسرے کے درمیان سے ہو کر گزرتے تھے۔ جس کمرے میں لفٹیننٹ کو بٹھایا گیا وہ پرانے اور قیمتی سامان سے بھرا ہوا تھا۔ دروازوں کے دستوں پر چاندی کا پتر اچڑھا ہوا تھا اور بڑی الماریوں میں بیش قیمت چینی تھالیوں، پیالے، چائے دانیاں اور صراحیاں سج رہی تھیں۔ کارنس کے اوپر بھاری بھرکم سنہری چوکھٹے والی مسولینی کی تصویر ٹنگی تھی۔ جس پر سرخ رنگ کا ریشمی غلاف چڑھا دیا گیا تھا۔ آمنے سامنے دیواروں پر چند ایک قدیم اطالوی روغنی تصویریں سجی ہوئی تھیں۔ ان کے رنگ بھدّے مدھم تھے اور معلوم ہو رہا تھا کہ ان پر سے گرد کبھی نہیں جھاڑی گئی۔ آتشدان کے دونوں بازوؤں پر سرخ گدے دار بوجھل آرام کرسیاں پڑی تھیں اور درمیان میں تپائی پر چاندی کا سگریٹ کیس اور راکھدان رکھا تھا۔ اس راکھدان میں سلگتا ہوا سگریٹ رکھنے والی جگہ سانپ کے مصنوعی پھن پر بنی ہوئی تھی۔ کمرے کا جو کونا خالی تھا اُسے کالے رنگ کے چھوٹے قد کے پیانو نے گھیر رکھا تھا۔ پیانو پر بھی گرد جم رہی تھی۔ اور اُس کے اوپر رکھے ہوئے کانسی کے مرتبان نما گلدان میں یوکلپٹس کی صرف ٹہنیاں ہی نیچے لٹک رہی تھیں۔ کھانے کی میز پر لیزا لیزا کی ادھیڑ عمر کی موٹی ماں، اس کا باپ اور لینورے تھی۔ کھانا بڑی بے دریغی سے بنایا گیا تھا۔ اس میں گائے کی زبان کے تلے ہوئے قتلے، مچھلی کا حلوہ، ابلے ہوئے آلو، بھُنے ہوئے مرغ، قیمہ آلوچوں کا مربہ اور انگور کی شراب بھی شامل تھی۔ انگور کی شراب کا ذائقہ کسیلا تھا۔ جیسے لوہے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں اُبلا ہوا پانی ٹھنڈا ہو گیا ہو۔ کھانے میں لفٹیننٹ کو جس چیز کی کمی محسوس ہوئی وہ سرخ مرچ تھی۔ کھانے کے بعد اسی پہلے کمرے میں آ کر گرم گرم سیاہ کافی کا دور چلا ——

لیزا کا باپ چھوٹے قد کا چوڑا چکلا طاقتور اطالوی بوڑھا تھا۔ جس کی حجامت اونچی تھی سر چھوٹا تھا اور ہٹلری انداز کی مونچھیں تنی ہوئی تھیں۔ گھنی بھنوؤں تلے آنکھوں کا رنگ مٹیالا تھا اور وہ نیم ٹھنڈے کپڑوں میں بڑی مشکل سے پھنس کر بیٹھا ہوا تھا۔ گدّے دار آرام کرسی پر لیٹ کر اس نے چھوٹی چھوٹی ٹانگیں قالین پر پسار دیں اور سونے کے خلال کو دانتوں میں پھیرتے ہوئے ڈکار نما غراہٹ کی سی آواز نکالی۔

"لینورے بڑی اچھی لڑکی ہے۔ اس کا گاؤں فلورنس سے ۱۸ میل

کے فاصلے پر ہے ۔ جنگ سے پہلے میں اپنے ہوٹل کے لئے انگور کی شراب وہیں سے منگوایا کرتا تھا۔ وہاں کے سیاہ انگور میٹھے ہوتے ہیں اور بہت جلد گل سڑ جاتے ہیں ۔ ایسے انگوروں کی نہایت عمدہ اور لذیذ شراب بنتی ہے۔"

لفٹیننٹ معری سگریٹ سلگائے اس کی ہاں میں ہاں ملائے جا رہا تھا۔ لیزا سنر رنگ کی چھوٹی چھوٹی لمبوتری پیالیوں میں گرم گرم سیاہ کافی انڈیل رہی تھی اور اس کی ماں چائے پر کھائے جانے والے خالص اطالوی کیک کے لئے باورچیوں کو ہدایات دینے گئی ہوئی تھی ۔ لینورے لیزا کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی بڑی دلچسپی سے لیزا کے باپ کی حکایات سن رہی تھی اور اس کے چہرے پر عجیب سی دلکشی تھی۔ زیادہ کھا جانے سے لیزا کی غلافی آنکھیں بند سی ہو رہی تھیں اور وہ مخمور سی حالت میں کافی انڈیل رہی تھی ۔ اپنا پیالہ اُٹھا کر اس نے ہونٹوں سے اسے چھوا اور پھر میز پر رکھتے ہوئے بولی ــــ

"لینورے کو ہم اپنے ہوٹل میں ہی ملازم رکھ رہے ہیں۔ یہ آج سے ہمارے یہاں کام کرے گی اور خوب کھائے گی ــــ ، خوب پئے گی ۔"

"ہاں" اس کا باپ سگار کے بادل چھوڑتے ہوئے بولا : ــــ

"میں بھی یہی چاہتا ہوں اور اب جبکہ ہمارے مہمان لفٹیننٹ ــــ نے اس کی ضمانت دے دی ہے، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے ۔ لیکن اسے بہت سوچ سمجھ کر کام کرنا پڑے گا۔ انگور یہاں کمیاب ہیں۔ ان کی شراب کا یہاں کال ہے اور پھر ہر قسم کے فوجی ہوٹل میں صبح شام آتے رہتے ہیں ــــ آج بمباری نہیں ہوئی ــــ ؟ شاید جرمن طیارے چھٹی منا رہے ہیں۔"

اس کے بعد اس نے ایک انتہائی احمقانہ لمبی انگڑائی لی جس میں اس کی ٹانگیں پوری پھیل گئیں اور جبڑے گدھے کے جبڑوں کی طرح کھل گئے ۔ وہ اپنے گلے کے اندر دو تین قسم کی آوازیں پیدا کرتے ہوئے کاہلی سے اُٹھا اور ریچھ کی طرح بازو ہلاتا سونے کے کمرے کی جانب چل دیا۔

لیزا نے جلدی سے لینورے کے گال چوم لئے ۔ جس پر وہ شرم سے لال ہو گئی۔

"اب میری بہن میرے پاس رہے گی ــــ سینور ــــ! آپ بھی ہمارے پاس آ جائیں ــــ ۔"

لفٹیننٹ خاموشی سے ہنسنے لگا۔ لینورے اُسے کنکھیوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں سوچنے

لگی۔ اس کا دل کتنا معصوم ہے۔ کاش وہ بھی ہمارے ساتھ رہ سکتا، آپ ہی آپ اسے میجر گریگوری اور کیپٹن واکر کا خیال آگیا اور اس نے نفرت سے بھنویں سکوڑ کر خیال ہی خیال میں ان دونوں کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ اس وقت کس قدر بدشکل معلوم ہو رہے تھے۔ ٹھیک ہے۔ برائی ہر جگہ ملتی ہے۔

چائے پر جو کیک لایا گیا وہ ایسے تھا جیسے کسی نے پلیٹ میں گول ترکی ٹوپی رکھی ہو۔ باہر سے اس کا رنگ بھی گہرا سرخ تھا اور جب اُسے کاٹا گیا تو اندر سے زرد نکلا جس میں جگہ جگہ نیلے رنگ کے ستارے سے بنے تھے یہ اطالوی کیک تھا جو اٹلی میں تہواروں کے موقع پر تیار ہوتا تھا، جہاں چند پیسے فالتو ہوں۔ اس کا ذائقہ سونفی اور میٹھا تھا۔ اس میں کشمش اور بادام بے تحاشا پڑے تھے۔ لیزا چائے کی تین پیالیوں کے ساتھ نصف کے قریب کیک کھا گئی۔ لینورے کو لفٹیننٹ نے بڑی مشکل سے زبردستی دو ٹکڑے کھلائے۔ اچھی طرح پیٹ بھر کر لیزا بسنٹ کرتے ہوئے سُست رفتار انجن کی طرح پیانو کی طرف گئی اور اس کا ڈھکنا کھول کر اسے بجانا شروع کر دیا۔ بھاری بھرکم سامان سے بھرے ہوئے بھدّے سے کمرے میں پیانو کے اونچے نیچے کرخت سُر سوتے میں اُٹھ کر پھرنے والے آدمیوں کے مانند اِدھر سے ادھر گھومنے لگے۔ انھیں سُن کر دل میں گمان ہوتا تھا کہ پیانو ضرورت سے زیادہ کھا گیا ہے اور اب واہیات قسم کی ڈکاریں لے رہا ہے۔ لیزا نے پیانو پر انگلیاں چلاتے ہوئے کہا:۔

"سینورے! یہ موتسارٹ ہے۔ اس میں جرمن قوم کا دل دھڑک رہا ہے ——"

اور لفٹیننٹ نے جب سروں کو غور سے سُنا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے برلن کے کسی عالیشان ہوٹل کے باغ میں پرشکم پیٹو یہودی کھانے کے بعد چہل قدمی کر رہے ہوں۔ ان بے ہنگم سروں میں جرمن قوم کا دل نہیں بلکہ لیزا کا معدہ دھڑک رہا تھا۔

شام کو لفٹیننٹ اپنے کوارٹر میں واپس آیا تو اس کا سر بوجھل ہو رہا تھا۔ اس نے اسپرو کی دو ٹکیاں پانی کے ساتھ حلق میں اتار دیں اور پلنگ پر گرتے ہی سو گیا۔

لیزا کے باپ کے ہوٹل کا نام القاہرہ تھا۔ یہ کوئی اتنا بڑا ہوٹل نہیں تھا۔ بالکل ایسے ہی تھا، جیسے قاہرہ کے کاروباری گنجان علاقوں میں درمیانے درجے کے ہوٹل ہوتے ہیں۔ لیکن بن غازی

ہیں اس کی نمایاں حیثیت تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہ کافی پرانا تھا اور شہر کے مشہور حصے میں تھا اور دوسری یہ کہ یہاں خالص اطالوی سیاہ انگوروں کی پرانی شراب مل سکتی تھی۔ جنگ کے باعث شہر کا تمام کاروبار معطل ہو چکا تھا اور ہوٹل کا کاروبار خوب چل رہا تھا۔ عرب، اطالوی، یہودی، سوڈانی، مصری اور ہسپانوی تاجروں، ٹھیکیداروں، چھوٹے موٹے دوکانداروں اور غیر ملکی کمپنیوں کے ملازموں کا القاہرہ میں ہر وقت جمگھٹا سا لگا رہتا تھا۔ صبح سے شام تک کوئی میز خالی نظر نہ آتی تھی۔ ایک ٹولی اُٹھ کر جاتی تھی تو دوسری اس کی جگہ آن لیتی تھی۔ جن کے پاس زیادہ پیسے ہوتے وہ انگوروں کی شراب میں بھگوئے ہوئے زرد اطالوی کیک کھاتے اور اعلیٰ ٹرکش سگرٹوں کا خوشبودار دھواں اڑاتے ہوئے مخمور چہرے اُٹھا کر موسیقی کا لطف اُٹھاتے۔ جن کے ہاتھ انگوروں کے گچھوں تک نہیں پہنچ سکتے تھے وہ کھجوروں کی تیز شراب پی کر سستے امریکی سگرٹوں کا لطف اُٹھاتے۔ تیسری قسم ایسے لوگوں کی بھی تھی جو ایک جیب سے تمباکو اور دوسری جیب سے کاغذ نکال کر اس کا سگریٹ بناتے اور کافی کا گرم گرم فنجان سامنے رکھ کر بڑے سکون سے بیٹھ جاتے اور شام تک بیٹھے رہتے۔ کسی وقت برطانوی، ہندی یا امریکی سپاہیوں کی منڈلی ہوٹل میں آن داخل ہوتی اور وہ اپنی بے معنی گفتگو اور بلند بے ہنگم قہقہوں سے فضا میں شور وغل کے بھنور سے ڈال کر باہر نکل جاتے۔ لیزا کا باپ بڑے کاؤنٹر کے آگے ستون کے پیچھے آرام کرسی پر نیم دراز سگار منہ میں دبائے چالاک لومڑی کی طرح ہر آنے جانے والے کا جائزہ لیا کرتا۔ چھوٹے سے ڈائس پر گانے والے تعداد میں کم تھے، لیکن شور مچانے میں وہ کسی سے بھی کم نہ تھے۔ انہیں دنیا جہان کی موسیقی میں ٹانگ اڑانے میں مہارت حاصل تھی۔ ابھی اگر رمبھا ہو رہا ہے تو دوسرے لمحے ہسپانوی لوک گیت شروع ہو گئے ہیں اور اس کے بعد اچانک عربی دف بجنے لگے ہیں اور رباب پر کسی نے مصری فلم کا کوئی مشہور گیت چھیڑ دیا ہے۔ ہوٹل کا ہال اگرچہ کافی کھلا ہوا تھا مگر میزیں اس قدر زیادہ تھیں کہ جوڑوں کو رقص کرتے ہوئے بار بار ادھر اُدھر دیکھنا پڑتا تھا۔ اور لوگوں سے جھک کر معذرت کرنی پڑتی تھی۔ رومیل کی کیل کانٹے سے لیس جرمن فوجیں سر پر کھڑی تھیں لیکن القاہرہ میں اگلے سال کے لئے انگور کی شراب سٹور کی جا رہی تھی۔ بمباری کے وقت صرف اتنا ہوتا کہ لوگ رقص ادھورا چھوڑ کر ستونوں کے پاس جمع ہو جاتے اور موسیقی بند ہو جاتی۔ اس کے بعد زندگی پھر اچھل کر گرنی ہوتی۔ آبشار کی مانند گیت اور نغموں کی جھنکار میں گم ہو جاتی۔ زندگی کا دریا ہمیشہ آگے کی طرف بہتا ہے۔

لینورے اسی ہوٹل میں ملازم رکھی گئی تھی۔ اس کی ڈیوٹی پانچ بجے شام سے شروع ہوتی اور رات کو بارہ ایک بجے ختم ہو جاتی۔ مکمل بلیک آؤٹ کی وجہ سے سرِشام ہی القاہرہ ہوٹل کی کھڑکیوں پر سیاہ پردے گرا دیئے جاتے اور میزوں پر موم بتیاں جلا دی جاتی تھیں۔ اس کے باوجود ان کی نسبت رات کو وہاں زیادہ رونق اور ہنگامہ ہوتا تھا۔ لینورے کا کام کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر بِل بنانا، کھانے پینے کی چیزوں کا حساب رکھنا۔ گاہکوں کی ضروریات کا خیال رکھنا اور خاص طور سے یہ دیکھنا تھا کہ انگور کی شراب ملازم آپس خورد برد تو نہیں کر رہے۔ اس کے لئے لیزا کے باپ نے اسے خاص طور سے ہدایت کی تھی۔ شروع شروع میں اُسے کافی دقت محسوس ہوئی اور وہ اتنے سارے لوگوں کے ہجوم میں گھبرا سی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ لوگوں کی تیز اور بے باک نگاہوں کی عادی ہو گئی اور وہ بل وصول کرتے وقت خالص کاروباری انداز میں مسکرا کر گاہک کا شکریہ ادا کرتی۔ لفٹیننٹ عام طور پر اتوار کے روز وہاں آتا اور کسی قریب کی میز پر بیٹھ کر کافی منگوا لیتا اور مسکراتے ہوئے لینورے کو بڑی پھرتی سے بل بناتے یا شراب کے پیمانے کا بار بار معائنہ کرتے دیکھا کرتا۔ کسی وقت وہ اُٹھ کر لیزا کے باپ کے پاس جا بیٹھتا اور اطالوی انگوروں کی نایابی اور کاروبار کی مشکلات پر بورنگ قسم کے لیکچر سُنا کرتا۔ پھر وہ کاؤنٹر پر کہنیاں ٹکا کر لینورے سے اِدھر اُدھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں شروع کر دیتا۔ لینورے کام میں مصروف رہتی اور ساتھ ساتھ اس کی باتوں کا جواب بھی دیئے جاتی۔ کسی بات پر وہ ہنس پڑتی تو اس کے باریک ترشے ہوئے ہونٹ کی نازک ٹہنیوں پر آلوچے کے سپید پھول مسکرانے لگتے اور نیلی آنکھوں کے سمندروں پر سنہری دھوپ چمک اٹھتی۔ کسی وقت جب گاہکوں کی آمد رفت ذرا مدھم پڑتی تو وہ گھڑی دو گھڑی کے لئے کاؤنٹر چھوڑ دیتی۔ وہ دونوں کسی کونے والی تنہا میز پر جا کر بیٹھ جاتے اور بڑے سکون کے ساتھ گرم کافی پیتے اور موسیقی سنتے۔ لفٹیننٹ کی خواہش پر لینورے ڈانس پر اطالوی لوک گیتوں کی فرمائش کہلوا بھیجتی اور پھر ہوٹل کی جھکی ہوئی بوجھل چھت تلے تمباکو، شراب اور کافی کی مہک میں لمبے درد بھرے سر جاگ اُٹھتے۔ لفٹیننٹ کو اطالوی لوک گیت بہت پسند تھے۔ ان میں وہی بھیگا بھیگا درد، سوز اور تڑپ تھی۔ جو اس نے پنجاب کے پہاڑی نغموں اور بنگال کے ماہی گیروں کے گیتوں میں محسوس کی تھی۔ اطالوی زبان کے بول اس کے لئے بے معنی تھے، لیکن آواز کے زیر و بم اور سروں کے اتار چڑھاؤ میں جورکی کی فریاد، دھیما دھیما سلگاؤ اور ادھوری تشنگی اور روح کا کرب اور بدن کی پکار لرز رہی تھی۔

الفاظ کے بیش قیمت لبادوں کے نیچے مفہوم کا جسم ہر جگہ ننگا ہوتا ہے اور اس اطالوی لوک گیت کی تہہ میں اسی مفہوم کے موتی چمک رہے تھے جو پنجابی بنگالی، ہندی اور برمی زبان کی سیپیوں میں پوشیدہ تھا۔ یہ ایک ہی درد کی ٹیسیں تھیں، ایک ہی غم کا نوحہ تھا اور ایک ہی جادے کے ماتم کناں تھے ——— اطالوی اور پنجابی زبان میں سات سمندروں کا فاصلہ حائل ہے لیکن اطالوی اور پنجابی آنسوؤں میں کوئی شے حائل نہیں۔ وہ ہر جگہ آنکھوں سے ٹپکتے ہیں اور ہر جگہ نمکین ہوتے ہیں اور یہی وہ پل ہے اور پگڈنڈی ہے اور دروازہ ہے جو ایک سمندر کو دوسرے سمندر سے، ایک کھیت کو دوسرے کھیت سے اور ایک گھر کو دوسرے گھر سے ملاتا ہے ——— !

کبھی کبھی لینورے اسے کسی گیت کا مطلب سمجھانے لگتی اور اپنے سامنے خشک ہونٹوں اور ہاتھوں کی ابھری ہوئی رگوں والے کسان کی تصویر دیکھتا جو فصل بونے کے بعد اداس نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے۔

"میرے کھیتوں پر سے ابھی ابھی ایک بادل گزرا ہے..... اور برسا نہیں۔

اور وہ برسا نہیں        میں اب گھر جا کر کیا کہوں گا۔؟

دوسرا بادل کب آئے گا۔؟        دوسرا بادل کب آئیگا"

غم کے گیت ہمیشہ کسی نہ کسی سوال پر ختم ہوتے ہیں۔ یہ سر ہر بار ایکا ایکی ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور یہ گنبد اپنے پیچھے اپنی ہی بازگشت چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔؟

ایک سوال ہے اور لفٹیننٹ سوچنے لگتا۔ شاید یہ سوال بھی کسی ادھوری فریاد یا ٹوٹے ہوئے سر کی صدر بازگشت ہو۔ پھر وہ کافی کے تلخ گھونٹ پی کر ان خیالات کو مصری سگریٹ کے خوشگوار فلیور میں تحلیل کر دیتا اور لینورے گول گول خوبصورت ٹھوڑی دونوں ہاتھوں کی مٹھی پر ٹکا کر خواب ایسی آواز میں اسے بتاتی کہ ایسے گیت اٹلی کے دیہاتوں میں بچے بچے کو یاد ہوتے ہیں۔ ان کا گاؤں اٹلی کے تمام دیہاتوں سے خوبصورت ہے وہ ایک گرم چشمے کے پاس الپس کے دامن میں آباد ہے۔ بچپن میں وہ اپنی ماں کے ساتھ اس چشمے پر جا کر میلے کپڑے دھویا کرتی تھی۔ پہلے پہل ان کے پاس اپنی زمین تھی لیکن وہ آہستہ آہستہ بکتی گئی اور تھوڑی دیر بعد چند ایک کھیت رہ گئے۔ جب وہ فلورنس کے ہائی اسکول میں آئی تو اس کے باپ نے وہ کھیت بھی بیچ ڈالے اور اب صرف انگوروں کا ایک چھوٹا سا باغ ہی رہ گیا تھا جس کی آمدنی بہت کم اور اخراجات بہت زیادہ تھے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہتی۔ جیسے ان اخراجات کا حساب لگا رہی ہو اور پھر کہنا شروع کرتی :۔

" اور اب تو وہاں باغ میں کام کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ آپ نہیں جانتے
انگور کا باغ بہت محنت طلب کرتا ہے۔ میرا باپ بہت بوڑھا ہو چلا ہے
میری بہن ابھی کمسن ہے اور دونوں چھوٹے بھائی شہر میں پڑھ رہے ہیں
ان کے تمام اخراجات میری تنخواہ سے پورے ہوتے تھے نہ معلوم اب وہ
لوگ کیا کر رہے ہوں گے۔ مجھے ان سے جدا ہوئے ڈیڑھ سال ہی بیتا
ہے لیکن یوں لگ رہا ہے جیسے کئی صدیاں گزر گئی ہوں ـــــ خدا
ان کی حفاظت کرے ـــ"

پھر وہ جیسے ایک دم خواب سے چونک اٹھی

"کافی دیر ہو گئی اب مجھے کاؤنٹر پر جانا چاہیے ـــ"

اور وہ دونوں ایک ساتھ میز پر سے اٹھتے۔ لینورے کاؤنٹر پر جا کھڑی ہوتی
اور لفٹیننٹ اسے اور لیزا کے باپ کو شب بخیر کہہ کر واپس اپنے کوارٹر کی راہ لیتا۔

وقت اسی طرح گزرتا گیا۔ لفٹیننٹ ہر شام کو ہوٹل القاہرہ میں آتا اور لینورے
کے قریب رہ کر کچھ خوبصورت لمحات گزارنے کے بعد واپس چلا جاتا۔ اس دوران میں
طبروق اور بن غازی کی جانب جرمن اور اطالوی فوجوں کا دباؤ بتدریج بڑھتا گیا اور پورے
مشرق وسطیٰ کے محاذ پر اتحادیوں کے قدم اکھڑنا شروع ہو گئے تھے۔

ایک شام لفٹیننٹ ہوٹل میں آیا تو اس نے دیکھا کاؤنٹر پر لیزا کا باپ خود کھڑا
تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ لینورے کی طبیعت خراب ہے اور وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی
ہے۔ وہ جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگتا لینورے کے کمرے میں پہنچا۔ وہ پلنگ پر چادر
اوڑھے نیم دراز تھی اور لیزا اس کے سر پر برف سے بھری ہوئی تھیلی رکھ رہی تھی۔ اسے
دروازے میں دیکھ کر لینورے کے چہرے پر افسردہ سا تبسم نمودار ہوا اور اس نے اسے اپنے
پاس بلا لیا۔ وہ آہستہ سے اس کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے ابھی علم ہوا کہ تم بیمار ہو ـــ میں ابھی نیچے سے آ رہا ہوں ـــ"
لینورے کچھ نہ بولی! صرف بڑی بڑی پژمردہ آنکھیں کھولے لفٹیننٹ کو دیکھتی رہی۔
آج ان آنکھوں کی نیلاہٹ دھندلی پڑ گئی تھی اور چہرے پر غمگین سا غبار اڑ رہا تھا۔ لیزا برف کی
تھیلی رکھ کر دروازہ بند کر کے چلی گئی دونوں ایک لمحے کے لئے خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے

کو دیکھتے رہے۔ لفٹیننٹ کو لینورے کے جسم سے ہلکا ہلکا شیریں سینک سا اٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔ آپ ہی آپ لینورے کی آنکھوں میں آنسو ابل پڑے اور وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ کیا کرے۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر لینورے کا سرخ بالوں والا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اُسے آہستہ سے اپنی طرف کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔

"تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی لینورے —— اس میں بھلا رونے کی کون سی بات ہے —؟ میں ابھی تمہارے لئے ملٹری ہسپتال سے دوا لاتا ہوں ۔"

لینورے سسکیاں روکتے ہوئے کپکپاتی آواز میں بولی :۔

"یہ بخار نہیں ہے جناب —— بخار نہیں ہے ....."

اس کے الفاظ پھر سسکیوں میں ڈوب گئے۔ لفٹیننٹ دیر تک اس کے سرخ بالوں کو پیار سے سہلاتا رہا اور اسے ہر طرح سے دلاسا دینے کی کوشش کرتا رہا جب لینورے کا جی ہلکا ہو گیا تو اس نے لفٹیننٹ کے سینے پر سے اپنا سر اُٹھایا اور پلنگ سے ٹیک لگا کر رومال سے آنکھیں پونچھنے لگی۔

"میں اس جگہ سے اکتا گئی ہوں۔ اب میرا یہاں بالکل جی نہیں لگتا۔ رات بھر میں نے اپنی ماں کو خواب میں دیکھا۔ وہ گرم چشمے پر کپڑے دھو رہی تھی اور اس کے گھر کا اگلا حصہ بم اڑا کر لے گئے۔ فلورنس پر بھی بم گر رہے ہیں۔ خدا جانے میرے بھائی کس حالت میں ہیں۔ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ میں اڑ کر ان کے پاس پہنچ جانا چاہتی ہوں۔ لیکن نہیں جا سکتی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں ان کے پاس کبھی نہ جا سکوں گی —— کبھی نہ جا سکوں گی۔"

"تم ضرور جاؤ گی لینورے —— ضرور جاؤ گی — ایک نہ ایک دن جنگ ختم ہو جائے گی اور پھر تم آزاد ہو گی اور جہاز میں بیٹھ کر اپنے گھر جاؤ گی۔ وہاں تم اپنی ماں سے ملو گی، باپ سے ملو گی اور ننھی میرا سے ملو گی، اور پھر تمہیں کتنی خوشی ہو گی اور تمہارے گھر میں اس روز کتنی رونق رہے گی۔ جنگ اب جلد ختم ہو رہی ہے ۔"

کمرے کا دروازہ کھلا اور لیزا گرم چائے کا پیالہ لئے اندر داخل ہوئی۔ لینورے سنبھل کر بیٹھ گئی۔ لیزا نے جب برف کی تھیلی تپائی پر دیکھی تو غصے میں آکر بولی:۔

"سینور! اب بتایئے میں کیا کروں، اسے اپنا ذرا بھی خیال نہیں ہے وہ دیکھئے برف کی تھیلی وہاں پڑی ہے۔"

لینورے مسکرانے لگی۔ لفٹیننٹ کو محسوس ہوا جیسے ساون کی لمبی جھڑی کے بعد سورج کی پہلی کرن نے بادلوں کے پیچھے سے جھانکا ہو۔ وہ بھی مسکرانے لگا اور پھر لیزا بھی ہنس پڑی۔ دو اڑھائی گھنٹے لینورے کے پاس گزارنے، ہنسی مذاق کی باتوں سے اس کا دل بہلانے کے بعد لفٹیننٹ نے اگلے روز آنے کا وعدہ کیا اور ہوٹل القاہرہ کی عمارت سے باہر نکل آیا۔

اس رات جرمن طیاروں نے بن غازی پر سب سے بڑا ہوائی حملہ کیا۔

سمندر کے کنارے کھڑے تینوں جہازوں میں آگ لگ گئی اور اتحادی رسدگاہ کی پوری کی پوری بارک کے پرخچے اڑ گئے۔ شہر میں متعدد عمارتیں جل کر راکھ ہو گئیں اور ہراساں لوگوں نے ضروریات کی چیزیں اُٹھا کر طبرق کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ صبح لفٹیننٹ دفتر گیا تو اس نے دیکھا کہ بارک کی آگ ابھی تک نہیں بجھی تھی۔ میجر گریگوری کے کمرے میں سٹاف آفیسروں کی ہنگامی مجلس ہو رہی تھی۔ بریگیڈ ہیڈکوارٹر کی طرف سے پرامن پسپائی کے لئے تیار رہنے کے احکامات آچکے تھے۔ وہ لینورے کے متعلق سوچنے لگا۔ رات شدید بمباری ہوئی تھی، بم شہر میں گرائے گئے تھے۔ خدا کرے کہ ہوٹل القاہرہ کی عمارت محفوظ رہی ہو۔ وہ دل ہی دل میں لینورے کے لئے دعائیں مانگنے لگا۔ وہ تو پہلے ہی بیمار تھی، بموں کے دھماکوں نے اس کے اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہوگا۔ وہ کسی نہ کسی طرح بڑی جلدی سے لینورے کو اپنی پسپائی کے احکامات کی اطلاع دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت ایک پل کے لئے بھی وہ ادھر ادھر نہیں ہو سکتا تھا۔ ٹھیک چھ بجے شام جبکہ لفٹیننٹ شہر جانے کے جتن کر رہا تھا۔ ہیڈکوارٹر سے فوراً بن غازی چھوڑ دینے کا حکم آگیا۔

لفٹیننٹ جہاں بیٹھا تھا وہیں بیٹھا رہ گیا۔ اس نے کبھی اس بات کا تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ لینورے سے ملے بغیر وہاں سے رخصت ہو جائے گا۔ وہ اس المیے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ اس نے میجر گریگوری سے کہا کہ وہ پانچ منٹ کے لئے شہر سے ایک ضروری چیز لانا چاہتا ہے۔ میجر گریگوری اس ضروری چیز، سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے خالص فوجی انداز میں انکار کرتے

ہوئے کہا کہ اگر اس نے شہر کی جانب قدم اُٹھایا تو اسے فوراً گرفتار کر لیا جائے گا۔ لفٹیننٹ مجبور ہو گیا۔ اسی رات بن غازی کمانڈ کی پوری کمپنی اپنا بوریا بستر اُٹھا طبروق کی طرف کوچ کر گئی۔

مگر رومیل اپنی فوجوں کے ساتھ بڑی تیزی سے مصر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اتحادیوں کے قدم طبروق میں بھی نہ جم سکے۔ چنانچہ انھیں وہاں سے بھاگ کر مصر میں پناہ لینی پڑی۔ تھوڑی دیر بعد مصر کو بھی، جرمنوں نے تین طرف سے گھیر لیا اور اتحادی پیچھے ہٹتے ہٹتے ایران کی سرحدوں تک جا پہنچے۔ ابھی تک مشرق وسطیٰ کی کمانڈ جنرل ڈیول کے ہاتھ میں تھی۔ ڈیول کافی حد تک ناکام ثابت ہوا اور اس کی جگہ جنرل منٹگمری نے لے لی۔ جنرل منٹگمری کی قیادت میں اتحادی فوجوں نے مصر کی ہر جانب سے جرمنوں کے خلاف بڑے وسیع پیمانے پر حملہ شروع کر دیا۔ برما، روس اور مشرقی یورپ میں بھی اتحادیوں کے پے در پے فتوحات حاصل ہو رہی تھی اور دشمن ہمت ہار چکا تھا۔ اس کے باوجود رومیل نے سخت مدافعت کی لیکن طبروق سے مجبوراً پیچھے ہٹنا پڑا۔ اتحادیوں نے طبروق پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اور بن غازی پر اندھا دھند ہوائی حملے شروع کر دیئے۔ بحیرہ روم میں سسلی اور شمالی افریقہ کی طرف سے بھی جرمنوں کی سپلائی لائن قریباً قریباً توڑ دی گئی۔ آٹھویں فوج کے جانبازوں نے ایک بار پھر دلندیزی اور امریکی طیاروں کی چھاؤں میں بن غازی کی سمت بڑھنا شروع کر دیا اور بالآخر بن غازی پر دوبارہ قبضہ ہو گیا

فوج کے ٹرک شہر میں سے گزرے تو لفٹیننٹ نے چاروں طرف گرے پڑے مکانوں کا ملبہ اور دھواں اگلتی دیواریں ہی دیکھیں۔ ان کے اپنے طیاروں نے شہر کو کافی نقصان پہنچایا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جرمنوں نے پٹرول اور گولہ بارود شہر کے اسکولوں، عبادت گاہوں اور ہوٹلوں وغیرہ میں جمع کر رکھا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتے ایسا ہی کرتے تھے چنانچہ کوئی شہر ایسا نہیں تھا جہاں سے وہ پسپا ہوئے ہوں اور وہاں کوئی عمارت سالم رہ گئی ہو۔

اس روز لفٹیننٹ کمپنی کیمپ چھوڑ کر شہر نہ آسکا۔ دوسرے دن تین چار بجے کے قریب اس نے موٹر سائیکل سٹارٹ کی اور بجلی ایسی تیزی سے شہر پہنچ گیا۔ شہر پہنچ کر اس نے وہی بات دیکھی جس کا اندیشہ کھائے جا رہا تھا۔ بڑے بازار میں دونوں جانب مکان ابھی تک دھواں دے رہے تھے۔ جگہ جگہ ملبے کے ڈھیر لگے تھے۔ لوگ اپنے اپنے مکانوں کے ڈھیر تلاش کر رہے تھے اور عورتیں روتے ہوئے بچوں کو چپ کرا رہی تھیں۔ چاروں طرف ویرانی اور سنگین اداسی چھائی ہوئی تھی۔ ایک جگہ پہنچ کر لفٹیننٹ رک گیا۔ جہاں وہ کھڑا تھا وہاں تین ماہ پہلے ہوٹل القاہرہ کی خوبصورت دو منزلہ

عمارت کھڑی تھی اور اب وہاں دروازے تھے اور کمرے غائب تھے۔ چند ایک لڑکھڑاتی دیواریں تھیں اور چھتیں اُڑ چکی تھیں ہوٹل کے صدر دروازے کے سامنے والے بڑے ستون پر عربی زبان میں صرف اتنا ہی لکھا باقی تھا۔

" اطالوی سیاہ انگور کی شراب اور کھانے کے ...... باقی کا آدھا حصہ اُڑا ہوا تھا۔

لفٹیننٹ کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں تھوڑا عرصہ پہلے وہ لینورے کے پہلو میں بیٹھا کافی اور مصری تمباکو کے خوشگوار فیلور میں اطالوی لوک گیت سُنا کرتا تھا۔ وہ کبھی یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اس کے سامنے لگے ہوئے ملبے کے ڈھیروں میں سرخ بالوں اور نیلی آنکھوں والی لینورے اور لیزا اور اس کا پیانو اور مجسمے اور خوبصورت تصویریں دفن ہیں۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے اور یہ پھر سب کچھ اتنی جلدی کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ زیادہ دیر اس جگہ کھڑا نہ رہ سکا۔ اس نے موٹر سائیکل گھمائی اور ایک پل کے لئے کچھ سوچنے کے بعد شہر کے بڑے ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہسپتال کی دو منزلہ عمارت کا عقبی حصہ بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ بڑے دروازے کی سیڑھیوں پر زخمی عارضی شامیانوں تلے پڑے کراہ رہے تھے۔ نچلی منزل میں زخمیوں کی چارپائیاں ایک دوسرے پر چڑھی ہوئی تھیں اور نرسیں سپید کٹھ پتلیوں کی طرح ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ اپنے اپنے عزیزوں کو دیکھنے آئے ہوئے مردوں عورتوں اور بچوں کا ایک ہجوم تھا جو لمبے وارڈ کے باہر جمع تھا۔ لفٹیننٹ نے وارڈ کے باہر لگی ہوئی زخمیوں کی فہرست دیکھی۔ اس میں وہ نام نہیں تھا جس کی اسے تلاش تھی۔ وہ کچھ مطمئن اور کچھ ناامید سا ہو کر دوسری منزل پر آگیا۔ یہاں بھی پہلی منزل ایسا عالم تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے فہرست پر عربی اور انگریزی میں لکھے ہوئے نام پڑھنے شروع کر دیئے۔ ایک نام پر پہنچ کر ایک دم رک گیا اور اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ یہ نام لیزا کے باپ کا تھا۔ اس کے بستر کا نمبر ۲۱۵ تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سرد اور ویران سے لمبے چوڑے وارڈ میں زخمیوں کے درمیان سے ہو کر گزر رہا تھا۔ بستر نمبر ۲۱۲ کے قریب کھڑے ہو کر اس نے تیسرے بستر پر ایک آدمی کو سپید چادر اوپر کئے لیٹے دیکھا۔ اس کے دونوں ہاتھ چادر سے باہر مُردہ ٹہنیوں کی طرح بستر سے نیچے لٹک رہے تھے اور وہ پاگلوں کی طرح آنکھیں کھولے منجمد نگاہوں سے چھت کو تک رہا تھا۔ لفٹیننٹ کچھ دیر اس جگہ بت کی مانند کھڑے رہنے کے بعد بستر نمبر ۲۱۵ کے پاس آیا اور اس پھٹی پھٹی آنکھوں اور مردہ چہرے والے زخمی کے نزدیک کرسی پر بیٹھ گیا۔ لیزا کے باپ نے کوئی حرکت نہ کی۔ اس کا رنگ ہلدی ایسا ہو گیا تھا۔ گالوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں

اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اگر لفٹیننٹ نے باہر فہرست پر نام نہ پڑھا ہوتا تو وہ اسے بالکل نہ پہچان سکتا تھا اس بوڑھے زخمی اطالوی اور لیزا کے باپ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ ہسپتال کے بستر پر چت لیٹا تھا اور وحشیوں کی طرح ٹکٹکی باندھے چھت کو گھور رہا تھا۔ اس کی مونچھوں کے بال بڑھ گئے تھے اور ماتھے پر دائیں جانب کسی زخم کے لمبے نشان پہ آیوڈین کا زرد نشان صاف نظر آرہا تھا۔ لفٹیننٹ نے آہستہ سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ ٹھنڈا اور خشک تھا۔ لیزا کے باپ نے چھت پر سے نظریں ہٹا کر ویران اور خاموش نگاہوں سے لفٹیننٹ کو یوں دیکھا۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"میں آپ کے گھر آیا تھا ـــــ آپ نے مجھے اطالوی کیک کھلایا تھا آپ کو یاد ہے نا ـــ؟ آپ کی طبیعت کیسی ہے ـــ؟"

زخمی انسان خاموش رہا۔ لفٹیننٹ قدرے اونچی آواز میں جھک کر بولا۔

"لیزا کہاں ہے ـــ؟"

زخمی پھر خاموش رہا۔

"لینورے کہاں ہے؟ میں اُسے بخار میں چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ کہاں ہو گی؟"

لیزا کے باپ نے کوئی حرکت نہ کی۔ وہ برف کی طرح سرد اور پتھر کی طرح بے جان آنکھیں کھولے لفٹیننٹ کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور پہلے کی مانند چھت کو ٹکٹکی لگا کر گھورنے لگا۔ اتنے میں ایک نرس وہاں آگئی۔ لفٹیننٹ نے کھڑے ہو کر اس سے بہت کچھ پوچھا۔ جس کے جواب میں نرس نے صرف اتنا کہا:۔

"بم اس کے ہوٹل پر گرا تھا۔ اس کے یہاں کوئی نہیں بچ سکا۔ اسے ملبے کے نیچے سے نکالا گیا تھا۔ اور وہ جب سے یہاں آیا ہے اسی طرح چپ ہے۔"

اتنا کہہ کر نرس نے غالباً پٹی بدلنے کے لئے لیزا کے باپ کے جسم پر سے چادر ہٹائی تو خوف کے مارے لفٹیننٹ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ زخمی کی دونوں ٹانگیں اوپر تک اکٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ وہاں نہ ٹھہر سکا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہسپتال سے باہر نکل آیا۔

جنگ ختم ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی پردیس میں آئے ہوئے فوجی اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔

لفٹیننٹ بھی واپس ہندوستان آگیا۔ پہلے پہل اس کا جی کہیں نہ لگتا تھا۔ چوبیس گھنٹے اس کی آنکھوں میں لینورے لیزا اور اس کے باپ کی وحشتناک صورت گھومتی رہتی۔ ہر روز رات کو خواب میں بیمار لینورے کو پلنگ پر لیٹے دیکھتا۔ اس کے سرخ بالوں میں آگ سی لگی ہوتی اور وہ اس کے سینے میں منہ چھپائے سسکیاں بھر رہی ہوتی۔

"میں گھر جانا چاہتی ہوں جناب —— میں گھر جانا چاہتی ہوں۔"

لفٹیننٹ نے ایک ماہ کی رخصت لی اور کشمیر چلا آیا۔ اس کا خیال تھا پہاڑوں اور وادیوں کی فضاؤں میں وہ لینورے کا درد انگیز خیال اپنے دل سے نکال سکے گا۔ لیکن یہاں پہنچ کر یہ درد اور زیادہ چمک اٹھا۔ سرینگر میں وہ صرف پندرہ دن ہی بمشکل گزار کر......... واپس پنجاب آگیا۔

وقت ہر غم کو بھلانے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ یہ کشمیر کی وادیوں سے زیادہ مہربان اور ہمدرد ہے۔ یہ جوں جوں گزرتا جاتا ہے غموں کے خشک پتّے ہمارے درختوں پر سے جھڑتے جاتے ہیں۔ وقت گزرتا گیا اور لفٹیننٹ بھی لینورے کو اس شدت سے یاد نہ رکھ سکا۔ آٹھ سال بیت گئے۔ اس دوران میں اس کی ایک بڑے اچھے گھرانے میں شادی ہوگئی اور وہ دو بچوں کا باپ بھی بن گیا۔ پھر ہندوستان تقسیم ہوگیا اور وہ اپنی رجمنٹ کے تمام مسلمان افسروں کے ساتھ پاکستان اٹھ آیا۔ پاکستان آنے کے تھوڑے ہی دن بعد اس نے کپتانی کا عہدہ حاصل کر لیا اور جب آٹھویں پنجاب رجمنٹ کے پہلے تین افسروں کو اعلیٰ فوجی تعلیم کے لئے انگلستان بھیجا جانے لگا تو ان میں اس کا نام بھی تھا۔

وہ لندن پہنچ گیا۔ دسمبر میں کرسمس کے تہوار پر پندرہ دنوں کے لئے فوجی کالج بند ہوا تو وہ فرانس سے ہوتا ہوا اٹلی آگیا۔ اس کے دل میں یہ چھپی ہوئی خواہش بدستور موجود تھی کہ وہ لینورے اس بدنصیب اطالوی لڑکی کے گاؤں جائے اور اس کے ماں باپ سے مل کر اس کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرے۔ ایک رات میلان میں آرام کرنے کے بعد وہ پھولوں کے شہر فلورنس پہنچکر رک گیا۔ لینورے نے اُسے جو کچھ بتایا ہوا تھا اُس میں اُسے صرف اتنا ہی یاد تھا کہ اس کے گھر کے باہر احاطے کے پاس سپیدے کا گھنا درخت ہے اور اس کے گاؤں کا نام "ویانسے" ہے جو فلورنس سے اٹھارہ میل پر ہے۔

ویانسے جانے والی گاڑی صبح آٹھ بجے چل کر پندرہ منٹ کے اندر ہی اندر

ایک چھوٹے سے پرسکون دیہاتی اسٹیشن پر جاکر ٹھہر گئی۔ وہ یہاں اتر پڑا۔ اس نے فوجی وردی کی بجائے عام گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔ اٹیچی کیس اس نے کلوک روم میں رکھ دیا اور خود اس پتلی سی خوبصورت درختوں میں سے گزرتی ہوئی سڑک پر چل پڑا جو ویانسے گاؤں کو جاتی تھی۔ اس گاؤں کی آبادی زیادہ نہیں تھی۔ ڈھلوانی چھتوں اور لمبے لمبے دودکشوں والے ایک منزلہ پرانے مکان، درختوں اور کھیتوں کے درمیان بے نیازی سے کھڑے تھے اور چمکیلی دھوپ میں کہیں سے بھینس کے ڈکارنے کی مسلسل آواز آرہی تھی جب وہ پورے گاؤں کے دو تین چکر لگا چکا تو ایک کسان نے جس کی ناک دسمبر کی سخت سردی میں سرخ ہو رہی تھی پتھر کے چھوٹے سے پل پر کلہاڑی کا پھل گھساتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا:۔

"تم کہاں جانا چاہتے ہو سینور ——؟"

وہ کچھ نہ بولا۔ وہ اس کسان کو کیا کہے کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے۔ پھر فوراً ہی وہ بول اٹھا۔

"وہاں گرم چشمہ ہے اور انگوروں کا باغ ہے ——"

کسان نے کلہاڑی والا ہاتھ پھیلا کر ایک طرف اشارہ کیا:۔

"ان درختوں کے پاس جاؤ سینور۔"

وہ جلدی سے ان درختوں کے پاس پہنچ گیا جہاں گرم پانی کا چشمہ تھا اور انگوروں کے باغ۔ چشمے کی طرف عورتوں کے کپڑے دھونے اور بولنے کی آوازیں آرہی تھیں اور انگوروں کے باغ میں سے وہ گزر رہا تھا۔ جھکے ہوئے چھاپوں میں انگور کی بیلیں سردی میں سوکھ گئیں تھیں اور زمین پر سنہری، بھورے اور زرد پتوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ باغ کے آخر پر جاکر اس نے سیدر کا ایک گنجان درخت دیکھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ کیا خبر لینیورے کہیں پاس ہی لکڑیاں جمع کر رہی ہو۔ درخت کے نیچے سورج کی ترچھی شعاعیں پڑ رہی تھیں۔ سامنے لکڑی کی باڑھ والا ایک احاطہ سا تھا۔ جس کے ساتھ ہی لمبی چمنی والے ایک منزلہ مکان کے آگے ایک بوڑھی عورت الگنی پر گیلے کپڑے پھیلا رہی تھی۔ اس کے پاؤں ٹخنوں تک بوٹ میں تھے اور سر پر نیلا رومال بندھا تھا۔ قریب ہی باورچی خانے کے باہر ایک نوجوان لڑکی گائے کا دودھ دوہنے کے لئے اس کی ٹانگوں میں

رسی ڈال رہی تھی ۔ نہ جانے کیوں خود بخود ہی وہ آگے بڑھا اور احاطے کی باڑھ کے پاس پہنچ کر بولا :۔

" مجھے سردی لگ رہی ہے اچھی بہن ۔ کیا یہاں کافی کا ایک پیالہ مل سکے گا"
لڑکی نے چونک کر اسے دیکھا اور برتن زمین پر رکھتے ہوئے کھڑی ہوگئی ۔ وہ ٹھٹھک سا گیا ۔ اس پر لینورے کا دھوکہ ہو رہا تھا ۔ اس کی شکل لینورے سے بے حد ملتی تھی ۔ صرف بالوں کا رنگ ذرا سیاہی مائل ہو رہا تھا ۔ اب لڑکی کی ماں بھی اسے دیکھ رہی تھی ۔ بوڑھی عورت ایک ہاتھ پیٹھ پر رکھے قدم قدم چلتی اس کے پاس آئی اور احاطے کا دروازہ کھول کر بولی :۔

" اندر آجاؤ اجنبی ---"

پھر اس نے لڑکی کو آواز دی ۔ " میریا جلدی سے کافی تیار کردو "

یہ میریا تھی ۔ لینورے کی چھوٹی بہن ۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے مکان میں لینورے بھی انتظار کر رہی ہے ۔ جس کمرے میں اسے بٹھایا گیا تھا وہاں سامان بڑا مختصر اور پرانے فیشن کا تھا ۔ صوفے کے گدوں میں سوکھی گھاس بھری تھی جو ایک دو جگہ سے باہر جھانک رہی تھی ۔ آتشدان میں لکڑی کا بڑا سا بجھا ہوا ٹھڈ پڑا تھا ۔ ایکاایکی اس کی نگاہ آتشدان کے اوپر گئی اور اس کا دل اچھل کر حلق کے قریب آگیا ۔

کارنس کے اوپر درمیانے سائز کی سیاہ چوکھٹے والی لینورے کی تصویر پڑی تھی ۔ وہ فوجی لباس میں تھی اور سر پر کشتی نما ٹوپی پہنے مخصوص انداز میں مسکرا رہی تھی ۔

اس کی ماں لکڑیوں کو آگ دکھاتے ہوئے بولی :۔

" ہم غریب لوگ ہیں سینور ۔ ہم چوبیس گھنٹے کمرہ گرم نہیں رکھ سکتے "

وہ کچھ نہ بولا اور بدستور لینورے کو اپنے سامنے مسکراتے دیکھتا رہا ۔ بوڑھی عورت نے اجنبی کو اپنی بیٹی کی تصویر دیکھتے پا کر ہلکی سی آہ بھری اور سوگوار لہجے میں کہا :۔

" وہ ہماری خاطر فوج میں چلی گئی تھی اور آج تک واپس نہیں آئی ۔ فلورنس کے بڑے دفتر سے صرف یہی اطلاع آئی تھی کہ وہ دشمن کی قید میں ہے ۔ اس کے بعد اس نے بن غازی سے ایک خط لکھا اور پھر کوئی خیر نہ لی ۔ اس بات کو نو سال ہوگئے ہیں ۔ اس کا باپ مرتے دم تک اس کا منتظر رہا ، خدا جانے وہ کہاں ہے ۔ اگر وہ زندہ ہے تو خدا اس کی حفاظت کرے

اور جلد اُسے اپنے گھر پہونچائیے اور اگر ......"

بوڑھی عورت رک گئی اور سینے پر سلیب کا نشان بنا کر کانپتے ہوئے ضعیف ہاتھ سے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھنے لگی۔ میریا کافی کا پیالہ لئے اندر داخل ہوئی۔ پیالہ میز پر رکھ کر وہ اپنی ماں کے پاس کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی۔ کافی گرم تھی اور اس کا ذائقہ جلی ہوئی لکڑی ایسا تھا۔ اس نے کافی کے دو گھونٹ پی کر مدھم آواز میں کہا۔

"کیا آپ مجھے اپنی بیٹی کا خط دکھلا سکتی ہیں۔ شاید میں کچھ اندازہ لگا سکوں"

"ضرور دیکھو میرے بچے ـــــ میریا! میرے صندوق میں سے لینورے کا وہ خط نکال لاؤ بیٹی "

خط اطالوی زبان میں تھا۔ میریا نے شکستہ انگریزی میں اس کا ترجمہ کرکے سمجھایا۔ لینورے نے یہ خط بن غازی سے ان دِنوں لکھا تھا جب شہر پر رومیل کی فوجوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس کی عبارت کچھ اس طرح تھی۔

" پیاری ماں! ۔

بن غازی پھر ہمارے پاس آگیا ہے۔ میں تمہیں تفصیل کے ساتھ کچھ نہیں لکھوں گی۔ میرے ساتھ یہاں ایک دلچسپ واقعہ ہوا ہے۔ جس نے میری زندگی اور میرے خیالات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ میں بہت جلد تمہارے پاس آرہی ہوں ساری باتیں زبانی بتاؤں گی۔ اور ماں! ......

میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔ تم بُرا نہ مانو گی اماں ـــ؟ اگرچہ یہ ہماری خاندانی روایات کے خلاف ہے لیکن ماں میں مجبور ہوں۔ میں یہاں شادی کرنا چاہتی ہوں۔ وہ فوج میں ہے۔ پھر کیا ہوا، ہم اسے اپنے گاؤں لے آئیں گے اور انگور کے باغ میں مل کر کام کریں گے۔

ابا کی طبیعت کیسی ہے؟ یہ خط اسے نہ دکھانا۔ میریا کو پیار۔ چھوٹے بھائیوں کے لئے کچھ روپے بھیج رہی ہوں۔

تمہاری بیٹی:۔

لینورے ایمیل

خط سُن کر اس پر عجیب سی خود فراموشی کی حالت طاری ہوگئی۔ وہ کچھ سُن بھی رہا تھا اور نہیں بھی۔ کچھ دیکھ بھی رہا تھا اور نہیں بھی۔ اس نے خواب ایسی کیفیت میں بوڑھی میزبان اور نیک صورت میریا کا شکریہ ادا کیا اور مکان سے باہر چل دیا۔ باورچی خانے کی دیوار کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے اُوچے کا پیڑ دیکھا۔ جس کی شاخوں پر سے پتے جھڑ چکے تھے اور سیاہ لمبی ٹہنیاں سوال بن کر اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ پیڑ کے پاس جا کر اس نے کانپتے ہاتھوں سے اسے آہستہ سے چھوا اور یوں پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا گویا وہ کسی کے سرخ اور بھورے بال ہوں۔ پھر اس نے بوجھل قدموں سے احاطے کا صحن عبور کیا اور انگور کے خزاں نصیب باغ میں سے ہوتا۔ خشک پتوں کے زرد اور سنہری قالین پر سے گزرتا۔ اسٹیشن جانے والی سڑک پر آگیا۔ سپیدے کے گنجان شاخوں والے درخت اس پر جھکے ہوئے تھے اور تپلی سڑک دسمبر کی تہر آلود سردی میں دھندلی اور ویران تھی۔ پتھر کے پل پر وہ کسان ابھی تک بیٹھا تھا۔ کلہاڑی اس کے پاس پڑی تھی اور وہ مٹیالے رنگ کے بھدے پائپ میں تمباکو بھر رہا تھا۔ اسے نہ جانے کیوں وہ اطالوی لوک گیت یاد آگیا جو اس نے لینورے کے پاس بیٹھے ہوئے ہوٹل القاہرہ میں سُنا تھا۔

"میرے کھیتوں پر سے ابھی ابھی ایک بادل گزرا ہے"

اور وہ برسا نہیں

اور وہ برسا نہیں

میں اب گھر جا کر کیا کہوں گا

دوسرا بادل کب آئے گا؟

دوسرا بادل کب آئے گا؟"

پھر اپنے آپ اس کی نگاہوں میں لمبے قد چھریرے بدن کی ایک لڑکی کی شکل آگئی۔ جس کے بال سرخ تھے جیسے پُرپیچ شعلے منجمد ہوگئے ہوں۔ ——— جس کی آنکھیں نیلی تھیں اور جس نے بالوں میں اُوچے کے سپید پھول سجا رکھے تھے ——— اور جس نے ایک شام اس کے سینے سے لگ کر سسکیاں بھرتے ہوئے کہا تھا:۔

"میرا یہاں جی نہیں لگتا جناب

میں گھر جانا چاہتی ہوں

——— میں گھر جانا چاہتی ہوں........"

••

وہ دونوں تیسری منزل کے ایک کمرے میں تھے۔ یہ چھوٹا سا کمرہ اپنی ہلکی نیلی روشنی کے ساتھ باہر سے یوں دکھائی دیتا گویا ٹرین کا کوئی ایر کنڈیشن ڈبہ ہے۔

بارش کا زمانہ قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ مکانوں میں بسنے والے لوگوں نے پسینے، بدبو اور گھٹن سے نجات پائی تھی۔ ہوا میں خاص طور پر رات میں ٹھنڈک ہونے لگی تھی۔ ہاں جب کوئی بڑا سا کالے رنگ کا پتنگا اپنی تیز بھنبھناہٹ کے ساتھ اندھا دھند کسی بجلی کے قمقمے کے چکر کاٹنے لگتا تو ایسا ہوتا کہ بارش کا موسم ابھی نہیں گیا۔

"نجمہ بھی ٹھیک اسی طرح سیدھی مانگ نکالا کرتی.... !" نوجوان نے کہا ــــــ "مگر وہ کبھی کبھی گدی تک مانگ لے جاتی..... یہ طریقہ اس نے ایک بنگالن سے سیکھا تھا۔"

نسرین چپ رہی۔ نظریں فرشی سنگار میز کے آئینہ پر جمائے۔ جس میں اسے اپنا دھندھلا دھندھلا نیلا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بالوں میں کنگھی کرتی رہی۔ جیسا کہ سونے سے پہلے کچھ عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔

نوجوان اس کے پاس ہی چاندنی پر کہنیوں کے بل اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ یوں لیٹنے سے اس کی سفید سلک کی قمیض اور خاکی زین کی پتلون میں جگہ جگہ سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ اس نے چند لمحہ جواب کا انتظار کیا۔ اور پھر کہنا شروع کیا ــــــ "کبھی کبھی نجمی اپنے داہنے

کان کے پاس اپنے بھورے بالوں کی ایک لٹ نکال کر "ل" سا بنالیا کرتی جو اس کے سرخ اور سفید بھرے بھرے گال پر بہت بھلا لگتا۔

نسرین کے چہرے پر بیزاری کا ہلکا سا انداز پیدا ہوا مگر زبان سے اب بھی اس نے کچھ نہ کہا۔ وہ سوچ رہی تھی یہ کیسا مرد ہے جس کے پاس بات کرنے کا بیوی کے سوا اور کوئی موضوع ہی نہیں۔ وہ دو گھنٹے سے برابر اسی عورت کا ذکر سنے جا رہی تھی۔ جواب دینا ہیں موجود نہ تھی۔ ان دو گھنٹوں میں وہ اس نوجوان کی متاہلانہ زندگی کے سارے بڑے بڑے حادثات و واقعات اس کی مرحومہ بیوی کی بہت سی عادتوں اور خصلتوں سے واقف ہو چکی تھی مثلاً یہ کہ اسے بچپن ہی سے اپنی بیوی سے عشق تھا...... یہ کہ نجمہ کا باپ انکی شادی کے خلاف تھا۔ مگر ماموں اور چچا موافقت میں تھے...... یہ کہ نجمہ لمبے قد کی تھی۔ اسے گانا سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جب وہ ہنستی تو اس کے بائیں گال میں گڑھا پڑ جاتا۔ اسے حنا کا عطر بہت پسند تھا...... وہ کروشیے سے موزے بہت اچھے بنا کرتی۔

شروع شروع میں تو نسرین کو اس ذکر سے کچھ یونہی سے دلچسپی ہوئی۔ جیسے کہ پہلے پہل عام طور پر ایک عورت کو دوسری عورت کے ذکر سے ہوتی ہے۔ مگر وہ جلد ہی اس سے بیزار ہو گئی تھی۔ اور آخر جب اس کی جماہیاں اور انگڑائیاں بھی اس کا پیچھا نہ چھڑا سکیں تو زچ ہو کر اس نے چپ سادھ لی۔

وہ جب چوٹی کر کے جوڑا باندھ چکی اور ان ہیر پنوں اور کلپوں کو جن سے وہ اپنے بالوں کی سجاوٹ میں مدد لیا کرتی تھی۔ فرش سے اٹھا کر سنگھار میز کے خانے میں ڈال رہی تھی۔ اس اثنا میں نوجوان کی نظریں اس کی گوری گوری انگلیوں کی معمولی معمولی حرکت کا پیچھا کرتی رہیں۔

دو منٹ خاموشی میں گذر گئے۔ کئی دن ہوئے۔ اس نوجوان نے نسرین کو دیکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اسے اپنی مرحوم بیوی کی یاد بے طرح ستانے لگی تھی وہ اس سے ملنے کی تدبیر کرنے لگا تھا۔ اور آخر جب اس نے اتنا روپیہ جمع کر لیا کہ دو راتوں کیلئے اس عورت کو خرید سکے تو اس سیدھا اس کے گھر کا رخ کیا۔

"میری بیوی....."

"تو گویا بہت محبت تھی اس کو بیگم صاحبہ سے؟" نسرین نے بات کاٹ کر کہا۔ اور جب ایک آدمی بولے ہی چلا جائے تو بات کاٹنی ہی پڑتی ہے۔

"بیحد...." بے ساختہ نوجوان کے منہ سے نکلا وہ اس کے طنز کو نہیں سمجھ سکا تھا۔

"مگر صاحب آپ کی باتیں بھی عجیب ہیں"۔ وہ ایک جذبۂ انتقام اس کے اندر جگا رہی

تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا وہ کیسی محبت تھی۔ جو اس کے مرنے کے تین مہینے بعد ہی رفو چکر ہو گئی ...."
وہ فقرہ پورا نہ کر سکی۔ شاید اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کیونکہ نوجوان اس کا مطلب بخوبی سمجھ گیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک گم سم رہا۔ اور اس نے اپنی صاف اور روشن آنکھیں اٹھا کر جن میں مجرمانہ گھبراہٹ یا گناہگارانہ شرمندگی کی کوئی علامت نہ تھی۔ نسرین کی طرف دیکھا پھر وہ التی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔ جیسے کہ وہ لیٹے رہنے سے اپنا بچاؤ پوری طرح نہ کر سکا۔ اس کے ہونٹ پل بھر کو لرزے مگر زبان کچھ نہ کہہ سکی۔

چند لمحوں تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اس کے بعد نسرین انگڑائی لیتی ہوئی اور بغیر کچھ کہے کمرے سے نکل گئی۔ کوئی پاؤ گھنٹے بعد وہ واپس آئی۔ زیور وغیرہ اس نے اتار دیئے تھے۔ اور رات کے سونے والی ایک سادا سی اجلی دھوتی باندھ لی تھی۔ وہ اس قدر آہستہ سے داخل ہوئی کہ نوجوان نے اس کے قدموں کی چاپ تک نہیں سنی۔ وہ چاندنی پر پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا اس کی عمر چوبیس پچیس برس سے کم نہ ہوگی۔ مگر اس وقت بجلی کے لیمپ کی مدھم روشنی میں وہ اپنی چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھوں گھنی بھووں اور چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کالج کے کسی چھوٹی جماعت کا طالبعلم معلوم ہوتا تھا اس کے سامنے چاندنی پر مٹر کے دانے کے برابر ایک سیاہ پتنگا اپنی ننھی ننھی بال سی ٹانگیں ہوا میں ہلا ہلا کر فرش پر رگڑ کر سیدھا ہونے کی کوشش کرتا۔ جب اسے ذرا بھی کامیابی ہوتی نوجوان ایک بجھی ہوئی سلائی کے سرے سے اوندھا کر دیتا۔

جب نسرین بالکل اس کے سر پر آ کھڑی ہو گئی تو وہ چونک پڑا۔
"اوہ ...... آپ ہیں" اور اس نے کچھ شرمندہ سا ہو کر پتنگے کو دیا سلائی سے پرے اچھال دیا۔
"بیگم صاحبہ کے مرنے کا رنج تو بہت ہوا ہوگا آپکو ؟" یہ سوال کر کے وہ خود حیران رہ گئی۔
نوجوان نے لمحہ بھر تامل کیا اور سنجیدہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔
"نہیں شروع شروع میں کچھ ایسا غم نہیں ہوا تھا۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ایسا ہو گیا۔ مگر میں زیادہ دن اس فریب میں نہ رہ سکا۔ میں بیمار پڑ گیا۔ مہینہ بھر چارپائی پر پڑا رہا۔ جب میری حالت خراب ہو جاتی تو امی جان اور زہرہ یہ میری چھوٹی بہن کا نام ہے۔ میرے سرہانے کھڑی ہو جاتی اور ایسی چپ چپ سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتی کہ میں آنکھیں بند کر لیتا اور اور چاہتا کہ نہ مروں۔ بس پھر میں رفتہ رفتہ تندرست ہو گیا۔
اس کے لہجے نے نسرین کو متاثر کیا۔

دو تین لمحے دونوں چپ رہے۔

"آپ نے کہا تھا" اچانک نسرین کے لہجہ میں شوخی جھلکنے لگی۔

"میری شکل بیگم صاحبہ سے ملتی جلتی ہے۔ بھلا کیا چیز ملتی ہے؟"

نوجوان نے پل بھر غور کیا۔

"سب سے زیادہ تمھاری آنکھیں انھی سے ملتی ہیں۔" یہ کہتے وقت اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ مگر لہجہ سے افسوس کا اثر دور نہ ہوا تھا۔ "ویسی ہی کالی اور گہری دوسرے نمبر پر ویسی ہی پتلی۔ اور تیسرے نمبر پر......!"

"چلئے چلئے بنائیے نہیں۔"

"تمھارے بال۔ تمھاری گردن......"

نوجوان کی فطری شوخی لوٹ آئی تھی۔ اور نسرین خود کو روکے ہوئے تھی کہ اس سلسلہ میں کوئی اور سوال نہ کر بیٹھے۔

آدھ گھنٹے بعد روشنی بجھا دی گئی تھی۔ اور وہ دونوں کھڑکی کے پاس پلنگ پر لیٹ گئے تھے۔ نوجوان جو رات کو جلدی سو جانے کا عادی تھا زیادہ دیر تک نہ جاگا۔ مگر نسرین آنکھیں کھولے دیر تک کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتی رہی۔

یہ چاند کے مہینہ کی آخری تاریکیوں کی رات تھی۔ آسمان صاف مگر اندھیرا اندھیرا سا تھا۔ تارے اتنی تیزی سے چمک رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا۔ زمین کے پاس سرک آئے ہیں۔ نسرین تاروں کو ہمیشہ دلچسپی سے دیکھا کرتی تھی۔ سب سے پہلے جب وہ تاروں سے واقف ہوئی اس کی عمر چار برس کی تھی۔ ماں مر چکی تھی مگر باپ زندہ تھا۔ اس نے باپ کے ساتھ ریل گاڑی میں ایک لمبا سفر کیا تھا۔ آدھی رات کو وہ دونوں ایک چھوٹے سے دیہاتی اسٹیشن پر اترے تھے اسی اسٹیشن پر لالٹین کی دھیمی روشنی میں ایک موٹے ننگ دھڑنگ فقیر نے اسے ایسی لال لال ڈراؤنی آنکھوں سے گھورا تھا کہ اس کی چیخ نکل گئی تھی اور وہ بے بس ہو کر باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی۔ کچھ دیر دونوں اسٹیشن ہی پر بیٹھے ٹھہرے رہے مگر کوئی سواری نہ ملی آخر باپ نے اسے گود میں لے لیا۔ گٹھری بغل میں دبائی اور اندھیرے گھپ میں پیدل چلنا شروع کر دیا۔

یہ سفر بھی بہت لمبا تھا۔ مگر اس کی ٹھہری ہوئی نظروں نے جلد ہی تاروں کو کھوج نکالا تھا۔ ان کو دیکھ کر اس کا ڈر کم ہونے لگا تھا۔ یہاں تک کہ وہ باپ کے کندھے سے لگ کر سو گئی۔ آنکھ کھلی تو اپنے کو ایک اجنبی عورت کے گھر پایا۔ وہ کئی دن تک روتی رہی مگر باپ کی صورت

دیکھنا اسے پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔
سویرے نسرین کی آنکھ کھلی تو سورج نکل آیا تھا۔ اٹھتے ہی سب سے پہلے اسے جو احساس ہوا وہ یہ تھا کہ نوجوان اس کے بستر پر موجود نہیں۔ اس نے سوچا غسل خانے میں ہوگا اور وہ کھلے کھلے بستر پر کروٹیں بدلنے لگی۔

جب پاؤ گھنٹہ گذر گیا اور نوجوان کہیں دکھائی نہ دیا تو اسے الجھن ہونے لگی۔ شمن جھاڑو لئے کمرے میں داخل ہوا تو اس سے پوچھا.... ”وہ رات والے بابو کہاں ہیں؟“

”چلے گئے“

”چلے گئے؟“ اس نے تعجب سے پوچھا۔

”جی ہاں سویرے ہی سویرے جب ہم سب سو رہے تھے دروازہ بھی تو کھلا چھوڑ گئے“

”ویسے تو خیریت ہے نا؟“ اچانک اُس کے منہ سے نکل گیا۔

”جی سب خیریت ہے“، شمن اس کا مطلب فوراً سمجھ گیا۔ میں نے اٹھتے ہی سب دیکھ بھال لیا تھا۔

اپنے شبہہ کے گھڑیال پر اسے شرم آگئی۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد اس فکر نے اسے کو گھیر لیا کہ وہ نوجوان چلا کیوں گیا۔ اس نے سوچا۔ رات اسے شاید میرا طعنہ برا لگا تھا۔ وہ بڑا جذباتی تھا۔ اوپر اوپر سے ہنستا بولتا رہا اور سویرے ہوتے ہی چل دیا۔

منہ ہاتھ دھو کر نیچے پھوپھی کے پاس جانے کو تھی کہ اچانک کسی کے جلد جلد سیڑھی چڑھنے کی آواز آئی۔ نوجوان گیا نہیں تھا۔ وہ رومال میں کچھ باندھے لئے آرہا تھا۔

”معاف کرنا“ اس نے اپنا پھولے ہوئے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میں تمھیں بتائے بغیر ہی چلا گیا۔ میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ یہ لو“ یہ کہہ کر اس نے رومال نسرین کے ہاتھ میں دیا۔

”کیا ہے؟“ نسرین نے پوچھا۔

”گوشت ترکاری؟ کس نے کہا تھا لانے کو“

”خفا کیوں ہوتی ہو۔ بات یوں ہے جب تجمی زندہ تھی میں اسی طرح منہ اندھیرے اسے جگائے بغیر گھر سے نکل جاتا۔ ہوا خوری کی ہوا خوری ہو جاتی۔ گھر کا سودا بھی لے آتا۔ ہماری نوکر رکھنے کی حیثیت نہیں تھی۔ بس اسی طرح مل بانٹ کر کام کیا کرتے۔ وہ گھر کا اور میں باہر کا۔ ذرا دیکھو تو گوشت کیا اچھا اور تازہ ہے۔ آدھا دست کا اور آدھا پشت کا اور گردا بھی ہے نوکر کا باپ بھی ایسا گوشت نہیں لا سکتا۔ اور پھر ذرا کچنال تو دیکھو آج ہی شہر میں آئی ہے۔ پھر

پیاز بھی ہے۔ ہری مرچ بھی ادرک بھی اور دھنیاں بھی۔"

نوجوان ڈاڑھی بھی منڈا آیا تھا۔ تھوڑا سا صابن اس کے کانوں کی لوؤں پر ابھی تک لگا رہ گیا تھا۔ نسرین کا جی چاہا کہ دوپٹے کے دامن سے صابن کو پونچھ دے۔ مگر وہ ایسا نہ کرسکی۔

"آپ نے بیکار تکلیف کی۔" نسرین نے کہا۔ "جراب لے آئے تو میں شمن کو بلواتی ہوں۔"

"نہیں نہیں اسے مت بلواؤ۔"

"یہ کیوں؟"

"میں کھانا خود پکاؤں گا۔ جب نجمی زندہ تھی تو کبھی کبھی میں ہنڈیا پکایا کرتا تھا۔ وہ سامنے مونڈھے پر بیٹھی مجھے بتاتی رہتی تھی۔"

"ہمارا شمن بھی بہت ہوشیار ہے۔" نسرین نے کہا۔ "ایسا کھانا پکاتا ہے کہ زبان چٹخارے لیتی رہ جاتی ہے۔"

"نہیں صاحب۔" نوجوان نے ایک دم فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ "نجمی کھنال ایک خاص ترکیب سے پکایا کرتی تھی۔ وہ ترکیب یا تو وہ جانتی تھی یا میں جانتا ہوں..... مہربانی کرکے آپ انگیٹھی کوئلے اور چاقو منگوا دیجئے۔"

نسرین نے اس سلسلہ میں کچھ اور کہنا ٹھیک نہ سمجھا اور چپ چاپ سیڑھی سے اتر گئی۔

"آؤ بیٹیا۔" نسرین کی پھوپھی نے اسے دیکھ کر اُگال دان میں پیک تھوکتے ہوئے کہا.....

"میں ابھی ابھی شمن سے کہہ رہی تھی کہ تمھارا اور اس کا ناشتہ اوپر لے جائیے۔"

"میں ناشتہ نہیں کروں گی۔ اس کیلئے اوپر بھیج دو۔"

"تم چپ کیوں ہو؟"

"نہیں تو......!"

"شکل سے تو بڑا کم زبان معلوم ہوتا ہے۔"

نسرین نے کچھ جواب نہ دیا۔

"کیا کر رہا ہے اس وقت؟" پھوپھی نے پوچھا۔

"ہنڈیا کا سودا لایا ہے خود ہی پکانے بیٹھا ہے۔"

نسرین کی پھوپھی کھلکھلا کر ہنس پڑی

"سچ۔"

"ہاں ہاں۔"

"بڑا ہی سیدھا سادا ہے۔"

"پاگل ہے رات بھر اپنی مری بیوی کی باتیں کر کے دماغ چاٹ گیا؟ شمن کو اس کے پاس بھیج دینا۔ ہاتھ بٹاتا رہے گا۔ میں ذرا نو بہار کے یہاں جاتی ہوں۔

نسرین کا خیال تھا کہ وہ کم از کم ایک گھنٹہ نو بہار کے یہاں ضرور ٹھہر گئی۔ مگر پاؤ گھنٹہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ اُٹھ آئی۔ سیدھی اوپر کی منزل پر پہونچی۔ دیکھا کہ کمرے کے باہر دالان میں انگیٹھی دہک رہی ہے اور نوجوان اس کے پاس ہی چھوٹی سی دری پر التی پالتی مارے بیٹھا پیاز کتر رہا ہے۔ آنکھیں لال ہو رہی ہیں۔ پانی بہہ رہا ہے۔ اس سے ذرا ہٹ کر شمن بیٹھا مزے سے یہ تماشہ دیکھ رہا ہے۔

"شمن"۔ نسرین نے بڑی سختی سے کہا: "تم بیٹھے منہ کیا تک رہے ہو۔ صاحب سے پیاز لیکر کیوں نہیں کترتے؟"

"میں تو کئی بار کہہ چکا ہوں" شمن نے منہ بنا کر کہا۔ "پر صاحب مانتے ہی نہیں۔ مجھے آگ جلانے کو کہا میں نے آگ جلا دی۔"

"اچھا تم نیچے جاؤ۔"

"حضرت اس عمر میں ہنڈیا پکانے کی کیا سوجھی ہے لائیے پیاز مجھے دیجئے اور جا کر آنکھوں پر چھینٹے دیجئے"۔ اور اُس نے ہاتھ بڑھا کر نوجوان کی گود سے پیاز کی رکابی خود اٹھالی۔

نوجوان نے کوئی اعتراض نہ کیا۔

دو گھنٹے کے بعد جب وہ دونوں دسترخوان پر کھانا کھانے بیٹھے تو نوجوان نے کہا "معاف کرنا میری وجہ سے تم کو اتنی تکلیف اٹھانی پڑی۔ بات یہ ہے کہ نجمی......"

"باتیں چھوڑیئے اور کھانا کھائیے۔

"واہ کیا مزے کا کھانا پکا ہے" نوجوان نے پہلا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا ——— "نجمی کے ہاتھ کا مزا یاد آگیا"

"چلئے جلدی بنایئے نہیں چپاتیاں تو دیکھئے کیسی ٹیڑھی لگی ہیں"

"چپاتیاں نجمی کو بھی پکانی نہیں آتی تھی۔ اور میں زیادہ تر تنور ہی سے روٹیاں لگوا کر لایا کرتا تھا۔"

"مجھے تنور کی روٹی زہر لگتی ہے"

"کبھی کبھی ہم کوئی سستا سا خانسامہ بھی رکھ لیا کرتے۔ مگر وہ پندرہ بیس روز سے زیادہ نہ ٹکتا۔ چپکے چپکے کسی اچھے گھر کی ٹوہ میں رہتا اور پھر کھسک جاتا"

کھانا کھا کر دونوں کمرے میں فرش پر آ بیٹھے۔

"آپ نے کہا تھا؟" نسرین نے کہا۔ "آج کل آپ کسی دوست کے یہاں رہتے ہیں"

"ہاں نجمی کے مرنے کے بعد میں نے امی جان اور زہرا کو تو گاؤں بھجوا دیا تھا اور خود ایک

دوست کے یہاں اُٹھ آیا تھا۔ یہ دوست بھی میری طرح اکیلا ہی ہے۔ ہم دونوں مکان کے کرائے کھانے پینے کے خرچ اور نوکر کی تنخواہ میں ساتھی ہیں۔"

"اور آدھی تنخواہ آپ امی جان کو بھیج دیتے ہیں؟"

"ہاں مگر وہ ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے کچھ نہ کچھ لوٹاتی ہی رہتی ہیں۔ کبھی گرم پتلون سلوانے کیلئے کبھی نئے بوٹ خریدنے کیلئے۔"

نسرین نے محسوس کیا اس کی ماں اسے بہت چاہتی ہوگی۔

"اپنی بہن کی کیا عمر بتائی تھی آپنے؟"

"دس برس۔ بڑی پیاری بچی ہے۔"

"اسکول جاتی ہے؟"

"نہیں گھر پر مولوی صاحب سے پڑھتی ہے۔ سینا پیرونا اسے دادی سکھاتی ہیں۔ اس نے ایک بکری پال رکھی ہے۔ دودھ سی سفید۔ ایک بھی کالا بال نہیں۔ زہرہ اس کی بڑی دیکھ بھال کرتی ہے۔ کھیت سے بوٹ توڑ لاتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے کھلاتی ہے۔ ہمارے گاؤں کے پاس ہی چھوٹی سی ندی بہتی ہے وہ پانی پلانے لیجاتی ہے۔ ایک دن کیا ہوا کہ بکری پانی پی رہی تھی کہ ایک بڑا سا کتا آیا۔ وہ زور سے بھونکا تو بکری ڈر کر ندی میں گر پڑی۔ پانی کا بہاؤ تیز تھا۔ وہ اس کے ساتھ بہہ چلی۔ اس پر زہرا نے چلا چلا کر برا حال کر لیا۔ اتفاق سے اُدھر سے ایک کسان گذرا۔ چلانا سُن کر دوڑا ہوا آیا۔ بڑی مشکل سے بکری کو نکالا۔ تب زہرا کی جان میں جان آئی۔"

نسرین یہ سادی سی بے رنگ کہانی بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔

اب نوجوان کو کچھ کچھ نیند سی آنے لگی تھی۔ وہ گاؤ تکیہ کے سہارے لیٹ گیا۔ دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں بند ہوگئیں اور وہ سو گیا۔

نسرین اُٹھی۔ الماری کے خانے سے سفید ململ کا دوپٹہ اور گوٹہ اُٹھا لائی۔ نوجوان کے پاس ہی فرش پر بیٹھ کر دوپٹہ میں گوٹہ ٹانکنے لگی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اس کا جی اکتا گیا اور وہ بھی پلنگ پر جا کر لیٹ گئی۔

تیسرے پہر ایک رکشہ منگوایا گیا اور وہ دونوں بازار جانے کی تیاری کرنے لگے۔ نوجوان نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اسے کوئی تحفہ خرید کر دینا چاہتا ہے۔ اس نے بغیر کسی شرم اور ہچکچاہٹ کے صاف صاف کہہ دیا کہ نسرین بیس روپیہ تک کی جو چیز چاہے خرید سکتی ہے۔ اس سے زیادہ کی اس میں ہمت نہیں۔

"یہ سچ ہے" اس نے کہا ——— "کہ اتنے کم داموں کی کوئی چیز تمھارے لایق نہیں

ہو سکتی۔ مگر میرا جی چاہتا ہے کہ میری کوئی چیز چاہے وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو تمھارے پاس یادگار بن کر رہے۔"

اور وہ اس کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گئی تھی۔ پھوپھی نے جانے کیلئے روکا تھا۔ مگر اب تو نسرین کو خود جانے کی ضد تھی۔ دوسرے نوجوان کے چہرے پر ایسی معصومیت جھلک رہی رہی تھی کہ کسی برے ارادے کا گمان تک نہیں ہوتا تھا۔ وہ چپ رہ گئی۔ اور اب نسرین نیلے رنگ کا برقعہ اوڑھے نوجوان کے پہلو میں رکشہ میں بیٹھی تھی۔

شہر کی کھلی سڑکوں پر ہزاروں عورتوں مردوں کے بہتے ہوئے، ہجوم میں یہ جوڑا بھی تھا۔ اسے دیکھ کر کسی کو یہ سوچنے تک کی پرواہ نہ تھی کہ ان کا تعلق بیوی اور شوہر کے سوا اور کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

وہ رکشے سے اتر گئی۔ پھر وہ بازاروں میں سے گذرے کئی دکانوں میں گئے۔

جب وہ سڑک پر چلتی تو اس کے آگے پیچھے راستہ صاف کرتا۔ اسے آنے جانے والی گاڑیوں موٹروں اور بھیڑ کی دھکا پیل سے بچاتا یوں اپنی حفاظت میں لیجاتا جیسے وہ بہت پاک چیز ہے جس کا دامن تک کسی سے چھو جانا اسے پسند نہیں۔ جب وہ کسی مکان میں داخل ہوتے تو اس کی پسند کی چیز دکاندار سے منگوا منگوا کر ایسی ادا سے پیش کرتا کہ دیکھنے والے یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے کہ کوئی نیا جوڑا ہے۔ اور یہ کہ شوہر بیوی سے بے حد محبت کرتا ہے۔

نسرین نے بڑی قیمت کی کوئی ایک چیز نہیں خریدی بلکہ روز آنہ کام آنے والی کئی چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدیں، جن میں سے کچھ کی تو واقعی اسے ضرورت تھی جیسے ایک چوٹی خریدی ایک ریشمی ازار بند۔ کچھ چھوٹی بڑی سوئیاں دو تین رنگین تاگوں کی ریل کچھ کروشیا کی سلائیاں۔ ایک فریم۔ دو تین قسم کے پاؤڈر کے ڈبے اور ربس۔ ان چیزوں پر بیس روپیہ سے کچھ کم ہی خرچ ہوئے۔ ہر ایک چیز خریدنے کے بعد وہ بڑی ادا کے ساتھ پوچھتی۔ "باقی کیا بچا؟"

واپسی پر نوجوان اسے ایک ریستوراں میں لے گیا۔ اور ٹھنڈی اور گرم کئی قسم کی چیزیں منگوائیں اور نسرین کو اپنی خواہش کے خلاف کئی چیزیں کھانی پڑیں۔ جس وقت وہ گھر پہونچے اچھا بھلا اندھیرا چھا گیا تھا۔ نسرین کی پھوپھی بڑی بے چینی سے اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ جب وہ صحیح سلامت گھر پہونچ گئی تو اس کی جان میں جان آئی۔

شمن سے کہہ دیا گیا تھا کہ وہ کھانا نہیں کھائے گا۔ چنانچہ شام کو اوپر کی سیڑھی

کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ نسرین نے پچھلی رات کی طرح کمرے کی ہلکی نیلی روشنی میں کنگھی کرنا شروع کی۔ نوجوان پھر اس کے پاس ہی چاندنی پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر دونوں چپ رہے پھر نوجوان نے کہا ——— "نسرین میں نے تمھیں نجمی کی بہت سی باتیں بتائیں مگر ایک بات نہیں بتائی۔"

نوجوان نے یہ بات ایسے سنجیدہ لہجہ میں کہی تھی کہ نسرین اچانک بول اٹھی۔

"وہ کیا؟"

نوجوان کچھ دیر چپ رہا اور پھر بولا: "وہ یہ کہ وہ ——— واقف نہیں تھی۔"

"کیا مطلب؟" نسرین نے حیرت سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ وہ کسی اور کو چاہتی تھی۔"

"جھوٹ۔"

"نہیں میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"اس کا ثبوت بھی تھا؟"

"مجھے ثبوت مل گیا۔"

"وہ کیا؟"

نوجوان تھوڑی دیر چپ رہا پھر بولا ——— "اس کے خط۔ میں نے غلطی سے اس کے نام کا ایک خط کھول لیا تھا۔"

یہ کہتے کہتے نوجوان ایک دم سخت ہو گیا اور اس نے گردن جھکا لی۔

"اور تم پھر بھی اسے چاہتے رہے؟"

"ہاں!" گھبرائی ہوئی آواز میں نوجوان کے منہ سے نکلا۔ "اس کے سوا چارہ ہی نہ تھا۔" کئی لمحے خاموشی رہی جسے توڑنے کی کسی میں خواہش پیدا نہ ہوئی۔

"کیا وہ جانتی تھی کہ تم اس کے اس راز سے واقف ہو؟" آخر نسرین نے پوچھا۔

"نہیں میں نے آخری دم تک اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس کی موت سے چند منٹ پہلے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سخت الجھن میں ہے اور مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مگر میں اس سے آنکھ نہ ملاتا تھا۔ البتہ دلداری اور تسلی کی باتیں برابر میرے منہ سے نکلتی رہیں۔ یہاں تک کہ اس نے آخری ہچکی لی اور رخصت ہو گئی۔"

کچھ دیر پھر خاموشی رہی جس کو خود نوجوان ہی نے توڑا۔

"آخر اس پر یہ ظاہر کرنے کا کیا فائدہ تھا۔"

اس رات پچھلی رات سے جلد ہی روشنی بجھا دی گئی۔ نوجوان پھر جلد ہی سو گیا۔ مگر
نسرین برابر تاروں کو جھلملاتے دیکھتی رہی۔ پچھلے پہر اچانک نوجوان نے سوتے میں
سسکی لی اور پھر تیز تیز سانس لینے شروع کر دیئے۔ نسرین نے سر اُٹھا کر اس کے
چہرے کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر سوچتی رہی پھر جس طرح کوئی بچہ سوتے سوتے ڈر جائے
تو ماں اسے چھاتی سے لگا لیتی ہے۔ نسرین نے بھی اسی طرح اس کا سر اپنے بازو
میں لے کر اسے اپنی گود میں بھینچ لیا۔
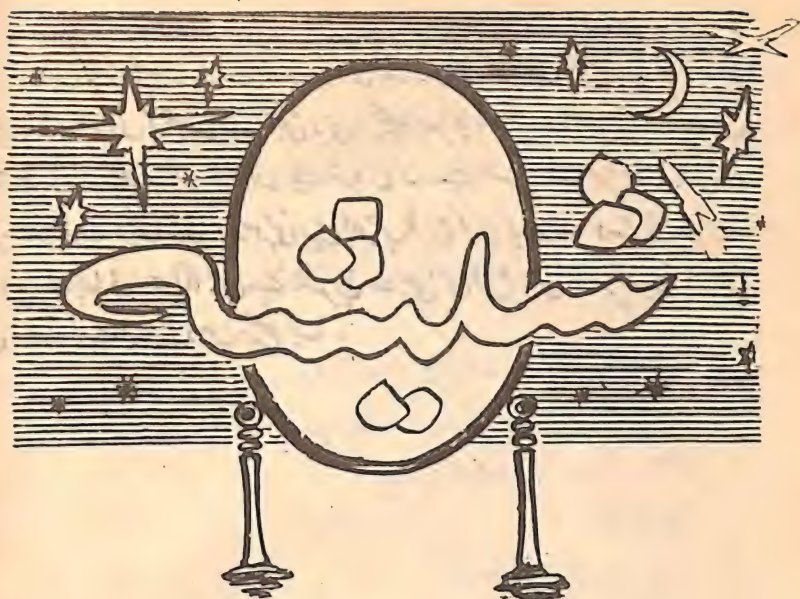
رائٹ پیٹرسن کے ہوائی مستقر پر میں نے سفید سوٹ میں ملبوس ایک شخص کو آگ کے بہت بڑے الاؤ میں اترتے دیکھا، تو میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس الاؤ کا درجۂ حرارت دو ہزار سے کسی طرح کم نہیں تھا اور یہ شخص اس میں دو منٹ تک رہا اور صحیح سالم باہر نکل آیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ جب میں نے اس کے بارے میں متعلقہ افراد سے دریافت کیا اور انھوں نے جو کچھ بتایا وہ میرے دماغ کو سُن کر دینے کے لئے کافی تھا مجھے بتایا گیا کہ اس شخص کا محافظ وہ سفید سوٹ ہے جو وہ پہنے ہوئے تھا۔ یہ سوٹ تہہ بہ تہہ شیشے کا بنا ہوا تھا۔ اس میں جو روئی استعمال کی گئی تھی، وہ بھی شیشے کی تھی۔ اس کے اندر کا درجۂ حرارت ایک سو تیس درجے سے زیادہ نہیں تھا۔

"آگے بڑھو، اس پر ہاتھ رکھ دو، ڈرو مت۔" اس حوصلہ افزائی کے باوجود مجھے آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی اور ہوتی بھی کیسے۔؟ اس عجیب و غریب شیشے کے نیچے جس چیز پر مجھ سے ہاتھ رکھنے کے لئے کہا جا رہا تھا وہ اٹھارہ سو درجۂ حرارت کا ایک تیز شعلہ تھا۔ شیشے کی موٹائی دو انچ سے زیادہ کی نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ بہت گرم ہو چکا ہوگا، لیکن میں اپنی بزدلی کا اعتراف بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دل کڑا کر کے شیشے کو انگلیوں کے پوروں سے چھو ہی لیا، مگر یہ کیا۔؟ شیشہ تو معمولی سا گرم

تھا، میں نے اپنی ہتھیلی اس پر چپاں کر دی۔

یہ انوکھا تجربہ مجھے امریکہ کی ایک شیشہ بنانے والی تجربہ گاہ میں ہوا تھا۔ یہاں شیشے کے متعلق اور بھی کئی تجربات کا انکشاف ہوا۔ میں نے ایسے شیشے دیکھے جو بول سکتے تھے، چھلانگ لگا سکتے تھے، جنہیں آری سے کاٹا جاسکتا تھا اور جس پر کیل ٹھونکے جا سکتے تھے۔ ایسے بھی شیشے جو فولاد سے زیادہ سخت اور المونیم سے زیادہ ہلکے تھے۔ تجربہ گاہ سے رخصت ہوتے وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب لکڑی، دھات اور کپڑے کی جگہ شیشہ استعمال کیا جانے لگا ہے۔

شیشے نے دور حاضر کی صنعت میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اب اس سے آگ سے بچاؤ کے ملبوسات کے علاوہ اور بہت سی مفید اور کار آمد اشیاء بنائی جاتی ہیں۔ اوون کارننگ فیبر گلاس کارپوریشن نے شیشے سے ریشم جیسا ایک مہین دھاگہ ایجاد کیا ہے۔ اس کا گولہ عام دھاگوں کے گولے کی مانند ہوتا ہے۔ لیکن اسے ذرا کھول کر تو دیکھو — لمبائی ۹۷ میل پہنچ جائے گی اس دھاگے سے گرمی اور سردی سے حفاظت کی ایسی ایسی حیرت انگیز چیزیں بنائی جاتی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ہوائی جہازوں اور پٹرول سے چلنے والی گاڑیوں میں یہ چیزیں دن رات استعمال ہو رہی ہیں۔ اسی کارپوریشن نے اپنی ان ایجادات کی کئی بار نمائش کی ہے جسے دیکھ کر لوگوں کو اپنی آنکھوں پر دھوکا ہونے لگا ہے۔ یہ شیشے کا دھاگہ عجیب و غریب کارنامے سر انجام دیتا ہے۔ نمائش میں ایک بڑا سا ڈبہ رکھا ہوتا ہے۔ اس کے کئی بڑے بڑے خانے ہوتے ہیں۔ آپ ایک خانے میں وہ تمام چیزیں بھر دیجیئے جن سے سموسے بنتے ہیں۔ دوسرے خانے میں آئس کریم کے جملہ لوازم ڈال دیجیئے اور تیسرے خانے میں چائے کی کیتلی رکھ دیجیئے اور پھر ان سب چیزوں پر شیشے کا دھاگہ لپیٹ دیجیئے۔ کسی قسم کی حرارت پہنچائے بغیر صرف آدھ گھنٹے میں آپ کی تینوں چیزیں تیار ہو جائیں گی۔

ایروکور شیشہ اونی کمبل بنانے کے لئے مشہور ہے۔ کمبل کے علاوہ اس شیشے سے گرم کوٹ اور بچوں کا سوٹ بھی بنتا ہے۔ لوگ اسے خالص اون سمجھ کر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ شیشے کے میز پوش اور کھڑکیوں کے پردے تو عام ملتے ہیں۔ ان پر آگ اثر نہیں کرتی اور نہ یہ سکڑتے اور پھیلتے ہیں۔ سورج کی کرنیں، اوس اور بارش بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ دھلنے پر یہ کلف اور استری کے محتاج نہیں۔ ان کی دھلائی بھی سوتی کپڑے کے مقابلے میں ایک تہائی ہوتی ہے۔ ان کی ساری خوبیوں کے باوجود ان کی قیمت سوتی کپڑے سے ذرا بھی زیادہ نہیں۔ چند برس پہلے یہ پردے سخت ہوا کرتے تھے۔ اور اکثر ٹوٹ پھوٹ جاتے تھے، لیکن اب ایسا نہیں۔ شیشے میں ایسی اشیاء کی

آمیزش کر دی گئی ہے جس سے اس میں لچک اور ملائمت پیدا ہو گئی ہے۔

میں نے ایک شخص کو شیشے کے پردوں کی نمائش کرتے دیکھا۔ اس نے دو پردوں پر ایک پر فاؤنٹین پین کی تمام سیاہی بکھیر دی اور پھر انھیں فرش پر خوب رگیدا۔ اس طرح سیاہی کے دھبے پردوں پر پوری طرح پھیل گئے، پھر انھیں نیم گرم پانی میں ڈالا، ساتھ ہی چٹکی بھر دھبے دور کرنے والا سفوف ملایا، پھر ان دونوں کو تولیے میں لپیٹ کر سوکھنے کے لئے لٹکا دیا۔ پردے پہلے سے بھی زیادہ صاف اور شفاف نظر آنے لگے۔ یہ سارے کام میں بمشکل پانچ منٹ لگے۔

بیس بال کے کلب اب اپنے کھیل کے میدانوں میں کینوس کے پردوں کے بجائے شیشے کے پردوں سے کام لیتے ہیں۔ یہ پردے گیند کو متعینہ حدود سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ کینوس کے پردے بارش میں بھیگ کر ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن شیشے کے پردوں پر پانی کا قطعاً کوئی اثر نہیں ہوتا اور کھیل جاری رکھا جا سکتا ہے۔ کاروں کی چھتوں پر شیشے کی چادر چڑھا دی جاتی ہے۔ جس سے کار کی عمر کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

میں نے کارننگ کارپوریشن کی فیکٹری میں شیشے کو بجلی کے لئے استعمال ہوتے دیکھا۔ شیشے سے لگا ہوا ایک بلب روشن تھا او رجلی کے تار کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ بات یہ تھی کہ تار شیشے کے اندر تھا جو نظر نہیں آتا تھا۔ اس تار کی موٹائی ایک انچ کا سولھواں حصہ تھی۔ شیشے کی بدولت اس کی طاقت چھ ہزار واٹ ہو گئی تھی۔ اس شیشے کا نام "ای سی" رکھا گیا ہے۔ کارپوریشن نے شیشے کے میٹر بھی بنائے ہیں جو بجلی کے میٹر کی طرح کام کرتے ہیں اور ان پر بہت کم خرچ آتا ہے۔

لیبی اوون فورڈ کمپنی نے ایک عجیب وغریب شیشہ بنایا ہے، اس کا نام "الیکٹراپن" رکھا گیا ہے، اسے تھرماس کی طرح ایک خاص درجۂ حرارت اور درجۂ انجماد تک لایا اور لے جایا سکتا ہے۔ ہوائی اور بحری جہازوں کے علاوہ موٹر گاڑیوں میں اس کا عام استعمال ہوتا ہے۔

یہ فوٹوگرافی کی ترقی کے لئے بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس شیشے میں ایسے اجزار ملائے جاتے ہیں جن سے تصویر شیشے پر مستقل طور پر منقش ہو جاتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ نیگیٹیو کو پہلے شیشے پر رکھا جاتا ہے اور وہی اس کا پوزیٹو بن جاتا ہے۔ اس کے بعد شیشے کو ایک برقی بھٹی میں رکھا جاتا ہے۔ فلم کے اجزار شیشے میں گھل مل جاتے ہیں اور تصویر شیشے کا جزبن جاتی ہے۔ نہ صرف تصویر ہمیشہ کے لئے شیشے پر مرتسم ہو جاتی ہے۔ بلکہ تین گنا بڑی بھی نظر آنے لگتی ہے اس شیشے کو نوٹالائٹ نام دیا گیا ہے۔

نیویارک میں اقوام متحدہ کے دفاتر میں ہلکے سبز رنگ کے جو شیشے لگے ہوئے ہیں، وہ لیبی اوون فورڈ کمپنی نے تیار کئے ہیں۔ ان شیشوں میں ایک خاص قسم کی چمک موجود ہے جو عام شیشوں میں نہیں ہوتی۔ ان میں فیرس آکسائڈ کی خاصی مقدار میں آمیزش کی گئی ہے جس کی وجہ سے یہ سورج کی شعاعوں کو منعکس کرنے کے بجائے انھیں جذب کر لیتے ہیں۔ یہ شعاعیں ان میں غیر معمولی چمک پیدا کر دیتی ہیں۔

شیشہ سازی کوئی نئی صنعت نہیں ہے۔ مصریوں نے اہرام تعمیر کرنے سے بہت پہلے شیشہ ایجاد کر لیا تھا اور صدیوں تک اس سے متنوع فوائد حاصل کرتے رہے، لیکن موجودہ دور کے سائنسدانوں نے تو کمال ہی کر دیا۔ انھوں نے شیشے کو ناقابلِ یقین حد تک انسانی زندگی میں داخل کر دیا ہے۔ مجھے ایک تجربہ گاہ میں ریشم کی طرح ملائم چیز دکھائی گئی۔ "یہ ان سے بنی ہے" ایک سائنس داں نے سبز رنگ کے شیشوں کے ٹکڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا پھر اس نے مجھے بتایا کہ وہ کیسے بنائی گئی ہے۔ پہلے شیشے کے ٹکڑوں کو دو ہزار پانچسو درجۂ حرارت تک پگھلایا گیا، پھر اس پگھلے ہوئے شیشے کو چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے دھات کی پلیٹ پر ٹپکایا گیا۔ اس کے بعد ان قطروں پر تیز ہوا چھوڑی گئی۔ جس سے وہ پھیل کر ریشے کی طرح بنتے گئے اور یہی ملائم، ریشمی پٹی میرے ہاتھ میں تھی جو صرف شیشے کے دس چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بنی تھی۔ سالم شیشے کو پگھلانے کے بجائے اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس طرح شیشے کا نقص نظر آجاتا ہے۔ اگر شیشہ کچا ہو یا صاف نہ ہو، تو ٹکڑے کرتے وقت اس کا پتہ چل جاتا ہے۔

اگر عام کپڑے کو جلا کر ہاتھ میں لیا جائے تو آگ کے شعلے جلد ہی ہاتھ تک پہنچ جائیں گے۔ لیکن شیشے سے بنائے ہوئے کپڑے میں یہ نقص نہیں ہے۔ اس میں دو ہزار درجۂ حرارت برداشت کرنے کی طاقت ہوتی ہے۔ یہ شبنم اور پانی کا اثر بھی قبول نہیں کرتے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ شیشے کی رسّی کتنی مضبوط ہوتی ہے۔ مجھے ایک جھولا دکھایا گیا جو شیشے کی رسّی کا تھا۔ پہلے تو میں نے اس پر ہلکا سا وزن ڈالا اور پھر پورے وزن سے جم کر بیٹھ گیا۔ لیکن رسّی ٹوٹی نہیں۔ کیونکہ وہ ایک لاکھ سے زائد ریشوں سے بنائی گئی تھی۔

شیشہ سازی کی بڑھتی ہوئی صنعت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری روزمرہ کے استعمال کی زیادہ زیادہ چیزوں کا انحصار شیشے پر ہوگا۔ بید کی کرسیوں کے بجائے آپ شیشے کے ریشوں سے بنی ہوئی کرسیوں پر بیٹھا کریں گے۔ شیشے کے آرام دہ تکیے پر سر رکھا کریں گے۔ سردیوں میں کپڑے بھی شیشے کے پہنا کریں گے۔ فریج بھی شیشے کا بنا ہوا ہوگا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ضروری ہے کہ سائنس دان شیشے کو اس حد تک قابل استعمال بنانے کے لئے دن رات محنت کریں ۔؟ اس کا جواب مجھے ایک سائنس داں نے دیا۔

" بات یہ ہے کہ شیشہ سلیکا سے بنتا ہے اور سب کو معلوم ہے کہ سلیکا ریت ہے ۔ یہ بھی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ ریت، فولاد اور پلاسٹک سے کہیں زیادہ ارزاں اور عام ہے۔ جب قدرت نے اس فراخ دلی سے ریت مہیا کی ہے، تو ہم کیوں نہ اس سے فائدہ اُٹھائیں "۔

وہ کہتے ہیں کہ اب تک شیشے کی ہزار کے قریب مختلف قسمیں بنائی جا چکی ہیں۔ اتنا بڑا کارنامہ کیونکر انجام پایا ۔! آیئے اس کا جواب ماہرین سے حاصل کریں۔ پہلے سلیکا، سوڈا اور چونے کا ایک مرکب تیار کر لیا جاتا ہے۔ اب صرف یہ فیصلہ کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ اس مرکب میں کیا ملایا جائے کہ شیشے کی مطلوبہ قسم تیار ہو جائے ۔ مرکب میں ملائے جانے والی تقریباً اسّی اشیاء ہوتی ہیں جن کی مقدار ایک چٹکی سے لے کر پیپے تک ہو سکتی ہے ، مثلاً : ایک لاکھ " کوبلٹ " میں شیشے کا ایک حصہ ملایا جائے ، تو اس کا رنگ نیلا ہو جائے گا۔ اگر دس ہزار کو بلٹ میں ملایا جائے، تو رنگ ارغوانی ہوگا ۔

سائنس دانوں کی پیش گوئی ہے کہ مستقبل قریب میں دس ہزار اقسام کے شیشے تیار کئے جا سکیں گے ۔ ذرا شیشے کی ان رکابیوں اور کٹوروں کا اندازہ لگایئے جنہیں میرے سامنے زمین پر بلندی سے پھینکا گیا اور ان پر خراش تک نہ آئی۔ یہی نہیں، بلکہ ایک دفعہ شیشے کے بنے ہوئے شہتیر کے دونوں سروں کو دو چبوتروں پر رکھا گیا اور شہتیر پر ہاتھی کو کھڑا کر دیا گیا۔ شہتیر لچکنے لگا۔ لیکن ٹوٹا نہیں۔
شیشے کی ایک اعلیٰ قسم کو مشینری کے ان پرزوں کی جگہ استعمال کیا جانے لگا ہے، جو ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ فیکٹریوں میں ان سے پائپ کی جگہ کام لیا گیا، تو یہ بہت دیر پا ثابت ہوئے۔ شیشے کے اسپرنگ کے متعلق یہ بات مشاہدے میں آئی کہ اس میں پچاس کروڑ مرتبہ لچک پیدا ہوئی۔ " فوم گلاس " قسم کا شیشہ عام شیشے کے مقابلے میں اتنا سبک ہے کہ اس کا ایک مربع فٹ ٹکڑے کا وزن صرف دس پونڈ ہے جب کہ عام شیشے کا اتنا ہی بڑا ٹکڑا ایک سو چھپن پونڈ وزن رکھتا ہے۔

آجکل سائنس دان شیشے کو زیادہ سے زیادہ شفاف بنانے میں کوشاں ہیں۔ اب ڈاکٹر زخموں کو شیشے کے دھاگے سے سینے کا تجربہ کر رہے ہیں۔ وہ مضبوط ہونے کے علاوہ نہ وہ کسی مادّے کو جذب کرتا ہے نہ غدود کو تکلیف پہنچاتا ہے۔ اس طرح دندان ساز بھی شیشے کے دھاگے سے کام

لینے لگے ہیں، کیوں کہ ان کے اعصاب متاثر نہیں ہوتے۔ شیشے کا دھاگہ بآسانی دانت کی جڑ تک پہنچ جاتا ہے اور بہت مضبوط ہوتا ہے۔

شیشہ بول بھی سکتا ہے۔ یہ بات تعجب خیز نظر آتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔ "پولا رائڈ" شیشے کے دو ٹکڑے کچھ فاصلے پر برقی روشنی کی شعاع کے سامنے رکھ دیئے جائیں۔ ایک ٹکڑے کو گھمایا جائے اور دوسرا ساکت رکھا جائے۔ یہ ٹکڑا جتنی تیزی سے گھومے گا دوسرے ٹکڑے سے ٹکرا کر موسیقی کی اتنی ہی تیز آواز سنائی دے گی۔ اس سے یہ امید بندھتی ہے کہ کبھی نہ کبھی ایک نیا ساز عالم وجود میں آجائے گا۔ دھند میں اس قسم کے شیشے سے پیغام رسانی کا کام بھی لیا جاسکتا ہے۔ ایک سائنس داں نے مجھ سے ٹوٹے ہوئے شیشوں کے ٹکڑوں کو بھینچنے کے لئے کہا۔ پہلے تو میں ہچکچایا، لیکن آہستہ آہستہ اپنی مٹھی بند کرنے لگا۔ میرے ہاتھ میں ذرا بھی خراش نہ آئی حالانکہ ٹکڑوں کے کنارے نوکیلے اور سطح سخت کھردری تھی۔ اس قسم کے شیشے ہوائی مستقر کی بتیوں کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں کہ ہوائی حملے یا توپوں کے گولوں سے بتیاں ٹوٹ جائیں، تو ہوائی جہاز کے ٹائر پنکچر نہ ہوں۔ اس شیشے سے فوجیوں کے لئے ایک نئی قسم کی وردی بنائی گئی ہے جس پر گولی کا اثر نہیں ہوتا۔ شیشے کا لباس سرد خطوں کے لئے بے حد مفید ہے۔ کیونکہ اسے پہننے کے بعد نقطہ انجماد سے چالیس درجے نیچے سردی میں بھی زندہ رہا جاسکتا ہے۔ سائنس نے ایک اور حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا ہے، شیشے کا ایک ایسا خول بنایا گیا ہے، جسے پہن کر غوطہ خور تین ہزار فٹ گہرے سمندر میں جاسکتا ہے۔ تارپیڈو کی شکل کا یہ خول آٹھ فٹ لمبا اور اتنا مضبوط ہے کہ اندر کی بڑی سے بڑی اور خوفناک مچھلی اسے نقصان نہیں پہنچا سکتی، وہیل ہو یا مگرمچھ۔ اگر اس خول کو غوطہ خور سمیت نگل بھی لے، تو اسے چند ثانیئے بعد اگلنا ہی پڑے گا۔ اس کا معدہ اسے ہضم کر ہی نہیں سکتا اور لطف یہ ہے کہ اس دوران میں غوطہ خور کی جان بالکل سلامت رہتی ہے۔ اس میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ پانی کے زیادہ سے زیادہ دباؤ کو بھی بآسانی برداشت کرلیتا ہے۔ اب تک المونیم اور فولاد کے جو خول استعمال کئے جاتے رہے ہیں، یہ ان تمام سے زیادہ بوجھل مضبوط او محفوظ ہے۔

* * * * *

# عظیم منصوبہ
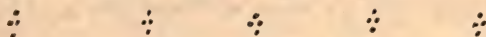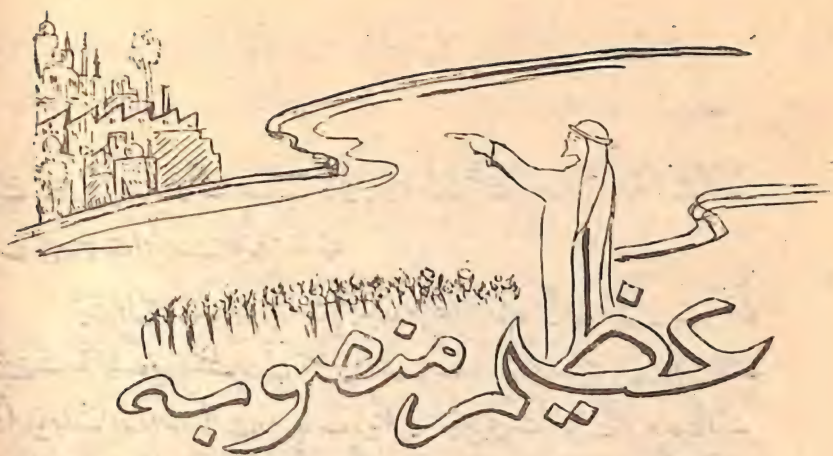
شیخ ابوالبرکات، محلے کی پرانی سی مسجد کے امام تھے۔ ان کی عمر کے پچاس سال غربت اور تنگ دستی میں بسر ہوئے تھے، پھر بھی وہ مطمئن اور مسرور تھے۔ انھیں اپنی غربت کا احساس تک نہ تھا وہ اس حدیث پر پوری طرح عمل پیرا تھے کہ: "دُنیا کی ایک نیکی کا بدلہ آخرت میں دس گُنا ملے گا" یہی وجہ تھی کہ وہ سخی طبیعت، کشادہ دل اور عالی حوصلہ تھے۔ فقرا، مساکین اور بھولے بھٹکے مسافروں کے کام آنا اپنا فرض سمجھتے۔ جو روکھی سوکھی گھر میں موجود ہوتی بلا تکلّف مہمانوں کے سامنے پیش کر دیتے دنیاوی نعمتوں سے انھیں کوئی غرض نہ تھی۔ مقدور بھر وہ اپنی آخرت سنوارنے میں منہمک رہتے۔ دنیا ان کی نظر میں دارِ فانی تھی اور آخرت دارِ باقی۔ انھیں اکثر بنی نوع انسان کی بدبختی اور بدحالی پر رونا آتا۔ ہر نماز کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کے حضور عہد کرتے کہ اگر انھیں کہیں سے بڑی مقدار میں دولت ہاتھ آگئی، تو وہ اُسے فوراً اپنے محلے کے غریبوں اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیں گے۔ اور پھر یوں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کر لی اور وہ اچانک مالدار بن گئے۔ یہ بہت سی دولت انھیں لاٹری کے ایک ٹکٹ پر ملی تھی۔ یہ ٹکٹ انھوں نے اپنی مرضی سے نہیں خریدا تھا اور نہ خریدتے وقت ان کے ذہن میں دولت حاصل کرنے کا خیال تھا۔ وہ تو صرف ٹکٹ فروخت کرنے والے غریب آدمی کی مدد کرنا چاہتے تھے۔

شیخ صاحب کو جب اپنے اچانک دولت مند بننے کی خبر ملی تو وہ حیران رہ گئے۔ تھوڑی دیر

کے لئے تو ان پر بے ہوشی اور بے خودی کا عالم طاری ہوگیا، لیکن وہ جلد ہی ہوش میں آ گئے۔ ان کی ضمیر کی گہرائیوں سے ایک آواز اُبھری :۔ "یہ مال تیرا نہیں ہے۔ اسے اپنے اوپر ہرگز صرف نہ کرنا، یہ تو فقرا اور مساکین کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے اس دولت کا نگراں مقرر کیا ہے تاکہ تو پوری دیانت داری سے اسے حاجت مندوں میں تقسیم کر سکے۔"

انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اس عطیے کا شکر ادا کرنے کے لئے آسمان کی طرف سر اُٹھایا۔ خوشی اور عجز کے ملے جلے جذبات سے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُنھوں نے قسم کھائی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا اپنا عہد امانت اور دیانت سے پورا کریں گے۔ وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے فوراً ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور ضرورت مندوں پر بخشش اور عطیات کی بارش شروع ہوگئی۔ ان کی فیاضی اور دریا دلی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی۔ لوگ ان کے گرد جمع ہوگئے اور دولت سمیٹنے لگے، وہ انھیں دعائیں دے رہے تھے۔ دن بھر سخاوت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہا اور شیخ صاحب کے چہرے پر ایک نورانی مسکراہٹ کھیلتی رہی، شام ہوئی تو وہ مسرت و شادمانی اور قناعت و اطمینان کی دولت لے کر گھر لوٹے اور بیوی بچوں کے ساتھ روکھی سوکھی کھا کر حسب معمول عبادت الٰہی میں مصروف ہوگئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جائے نماز ہی ان کی حقیقی پناہ گاہ تھی۔ اس رات انھوں نے بڑے عجز و نیاز اور خضوع و خشوع کے ساتھ خدا سے اپنی مغفرت اور اس کی رضا مندی کی دُعا مانگی۔

دن گزرتے چلے گئے، شیخ صاحب کی سخاوت و فیاضی میں کوئی فرق نہ آیا۔ جو بھی اُن کے سامنے ہاتھ پھیلاتا اپنی مراد پا لیتا۔ ان کے دروازے پر دور دراز سے آئے ہوئے سائلوں اور حاجت مندوں کا ہجوم رہتا جونہی وہ گھر سے نکلتے لوگ تحسین و آفریں کے کلمات دہراتے ہوئے ان کی طرف لپکتے۔ کوئی تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا مانگتا، کوئی اپنے کسی عزیز کے لئے دوا کے پیسے اور کوئی بچوں کی فیس ادا کرنے کے لئے تھوڑی بہت رقم۔ شیخ صاحب ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے اور دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھتے۔

آہستہ آہستہ انھیں احساس ہونے لگا کہ حاجتمندوں اور سائلوں کے ہجوم میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ بعض ضرورت مند بڑی ذلّت اور عاجزی سے التجا کرتے اور بعض انتہائی ڈھٹائی اور بے شرمی سے اپنا مطالبہ منوانے کی کوشش کرتے۔ بعض اوقات تو شیخ صاحب پریشان ہو جاتے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کیا کریں۔ ایک روز ان کے ایک دوست نے ناصحانہ انداز میں

سمجھاتے ہوئے کہا:۔

"شیخ صاحب، سخاوت وہ فیاضی کا جو طریقہ آپ نے اختیار کر رکھا ہے، درست نہیں۔ آپ نے ایسے لوگوں کو عطیات اور خیرات سے نوازا ہے جو ہرگز اہل نہیں ہیں۔ اس کے برعکس بہت سے ایسے مستحق لوگ ہیں جنہیں آپ کی خیرات میں سے کچھ نہیں ملا۔ آپ کو سوچ سمجھ کر ایک منصوبہ تیار کرنا چاہیئے تاکہ واقعتاً حاجت مند لوگ فائدہ اٹھا سکیں اور آپ کی رقم صحیح مصرف پر خرچ ہو۔

شیخ ابوالبرکات نے حکمت و دانشمندی کے ان کلمات کو نہایت غور سے سنا اور فیصلہ کیا کہ وہ صرف انھیں لوگوں کو خیرات کا مستحق سمجھیں گے جن کے متعلق ان کے پاس پوری معلومات ہوگی۔ چنانچہ اس دن سے شیخ صاحب نے اجنبی لوگوں پر سخاوت کرنے سے گریز کیا۔ انھوں نے سوچا کون جانے وہ لوگ ضرورت مند ہیں یا یوں ہی بن رہے ہیں۔ ان کے دماغ میں منصوبوں کا ایک طوفان سا امنڈ آیا، وہ ایک ایک کر کے ان پر غور کرنے لگے۔ لیکن ہر منصوبے میں کوئی نہ کوئی پیچیدگی سامنے آجاتی۔ مسائل در مسائل پیدا ہوتے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کون سا طریقہ اختیار کریں۔ ایک روز تو وہ اس کھیڑے سے عاجز آگئے۔ ان کے جی میں آئی کہ ساری دولت کسی رفاہی ادارے کے حوالے کر کے اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں، لیکن فوراً ہی ضمیر نے ملامت کی۔ کیا یہ فرض کی ادائیگی سے انحراف نہیں۔ خدا نے انھیں بیکسوں کی امداد کا فرض سونپا تھا، وہ کیوں کر اس فرض کو فراموش کر سکتے تھے۔ پھر انھیں یہ خوف تھا کہ کہیں وہ رفاہی ادارہ اس امانت کے لئے نااہل ثابت ہو، اور خدا کے عطا کردہ مال کو برباد نہ کر دے، وہ جانتے تھے کہ طمع اور ہیرپھیر دو ایسی عادتیں ہیں جو انسانی فطرت میں داخل ہیں، چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی دوسرے کو فقرا و مساکین کے معاملات کا نگراں نہیں بنائیں گے اور خدا نے انھیں جس کام پر مامور کیا ہے اس سے اعراض نہیں کریں گے۔

غربا اور مساکین کی حاجت روائی کے بعد شیخ ابوالبرکات گھر لوٹے، تو ان کی بیوی جھجکتے ہوئے بولی:۔

"کیا اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اس مال میں ہمارا کوئی حصہ نہیں۔؟ آخر ہماری باری کب آئے گی۔؟ ہمارے بھی ننھے ننھے معصوم بچے ہیں؟ ہمارے پاس ان کا تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا تک نہیں آپ اجنبی سائلوں کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں، لیکن اپنے اہل و عیال کو فراموش کر دیتے ہیں، حالانکہ یہ بچے آپ کی امانت کے زیادہ محتاج ہیں۔"

شیخ صاحب بیوی پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالتے ہوئے بولے :۔

"یہ مال میرا نہیں ہے، اسے اپنے یا اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ یہ تو بے کس اور نادار لوگوں کی امانت ہے۔"

بیوی نے ایک بار پھر ہمت کر کے کہا :۔

"تو کیا ہم نادار اور بے کس نہیں ہیں۔۔؟"

"ہمارے پاس اپنی ضرورت کا سب کچھ موجود ہے۔ اس دنیا میں ہم سے بھی زیادہ مستحق لوگ موجود ہیں، میں انھیں لوگوں کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"معلوم ہوتا ہے آپ کو اپنے بچوں سے محبت نہیں رہی۔"

"میں کہتا ہوں یہاں سے چلی جاؤ۔ دور ہو جا میری نظروں سے، تو چاہتی ہے کہ میں اپنے راستے سے بھٹک جاؤں۔" شیخ صاحب نے بیوی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

بے چاری عورت روتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے بچے بھی سسکیاں بھرتے رخصت ہو گئے۔ شیخ صاحب کی نظر بچوں کے پھٹے ہوئے کپڑوں پر پڑی، تو وہ کانپ اُٹھے تو فوراً جائے نماز پر کھڑے ہو کر خدا سے دعائیں مانگنے لگے کہ وہ انھیں لغزشوں سے بچائے۔

اگلی صبح ایک شخص نے ان کے دروازے پر دستک دی اور اپنی بدحالی کا رونا روتے ہوئے درخواست کی کہ اسے اپنے بچوں کا تن ڈھانپنے کے لئے کپڑے چاہئیں۔ شیخ صاحب کچھ دیر اس شخص کی طرف دیکھتے رہے۔ اچانک ان کی نظروں کی سامنے اپنے ننگ دھڑنگ بچے آگئے۔ اُنھوں نے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے جیب سے حقیر سی رقم نکالی اور سائل کے ہاتھ پر رکھ دی۔ سائل کے ماتھے پر بل پڑ گئے ۔

"شیخ صاحب ان سکوں سے تو ایک کرتا بھی نہیں خریدا جا سکتا، میرے بچے تو خاصے بڑے ہیں اور ان کی تعداد بھی خاصی ہے۔"

شیخ صاحب تیزی سے بولے :۔ "بس بس، میں یہی کچھ دے سکتا ہوں۔ میرے کندھوں پر ایک اہم خیراتی منصوبہ پورا کرنے کی ذمہ داری آن پڑی ہے۔ مجھے اس منصوبے کے لئے بہت سی رقم چاہئے جو کچھ دیا ہے اس پر قناعت کرو۔" وہ شخص بڑبڑاتا ہوا چلا گیا

چند روز بعد ان کے پاس ایک ایسا سائل آیا، جو پہلے بھی کئی بار ان کی فیاضی سے بہرہ ور ہو چکا تھا۔ وہ بظاہر دُبلا پتلا اور بیمار نظر آتا تھا۔ اس نے ان کے سامنے بھوک کی شکایت کی اور قسم کھائی کہ

وہ کئی دن سے فاقہ کر رہا ہے۔ یہ کہہ کر وہ لڑکھڑایا اور ضعف و نقاہت کی وجہ سے گر پڑا۔ شیخ صاحب نے سہارا دے کر اسے اُٹھایا اور اس کی جیبیں بھرنے لگے۔ سائل کا سر فرطِ عقیدت سے جھک گیا، وہ انھیں دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد شیخ صاحب نے اسی سائل کو محلے کے ایک ہوٹل میں بھوک مٹاتے دیکھا۔ اس کے سامنے ایک بڑا سا تھال رکھا تھا جس میں سے بھُنے ہوئے گوشت کی خوشبو اُٹھ رہی تھی شیخ صاحب کی اپنی آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ انھوں نے فوراً سر جھکا لیا اور تیز قدموں سے گھر کی طرف چل دیئے۔ گھر پہنچ کر جب وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھے، تو ان کے سامنے ایک چھوٹی سی پلیٹ میں باسی پنیر اور خشک روٹی کے کچھ ٹکڑے رکھ دیئے گئے۔ اگلے ہی لمحے کئی ہاتھ پلیٹ کی طرف اُٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے پلیٹ صاف ہوگئی۔ شیخ صاحب ملول ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور جائے نماز بچھالی۔

اگلے روز وہ بھوکا سائل پھر آیا اور شیخ صاحب سے مدد کی درخواست کی۔ اس مرتبہ شیخ صاحب نے اس کی ہتھیلی پر چند معمولی سکّے رکھ دیئے، وہ غصّے اور ناراضگی میں بکتا جھکتا چلا گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد شیخ صاحب بازار سے گزرے تو ان کی نظر "بھوکے سائل" پر پڑی جو راستے میں ایک طرف بیٹھا خشک روٹی پانی سے نگلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

جمعے کے روز شام کے وقت شیخ صاحب گھر پہنچے ہی تھے کہ ایک دوکاندار نے دروازہ کھٹکھٹایا اور درخواست کی کہ وہ اپنی بیوی کے خریدے ہوئے مال کی قیمت ادا کریں۔ شیخ صاحب بل پر نظر ڈالتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔ دُکاندار سے انھوں نے ایک دن کی مہلت مانگی اور بیوی کے پاس جا کر بولے:

"یہ کپڑے کیسے ہیں جن کی قیمت یہ دوکاندار مجھ سے مانگ رہا ہے۔"

"مجھے اور میرے بچوں کو کپڑوں کی ضرورت تھی اس لئے میں نے یہ کپڑے خریدے ہیں۔" بیوی نے اطمینان سے جواب دیا۔

"میں یہ کہتا ہوں تمھیں یہ جرأت کیونکر ہوئی۔ تمھیں معلوم ہے میں ایک غریب آدمی ہوں، ان فضول خرچیوں کے لئے روپیہ کہاں سے لاؤں گا۔"

"جانے بھی دیجیئے آپ کے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ اس جیسے سیکڑوں بل آپ آسانی سے ادا کر سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ جھٹ کپڑوں کی گٹھری اُٹھا لائی اور مسکراتے ہوئے بولی:-

"دیکھیئے تو سہی کتنے شاندار کپڑے ہیں۔ سچ سچ بتایئے جب آپ کے بچّے اور بیوی یہ کپڑے

پہنیں گے، تو آپ کو خوشی نہیں ہوگی ۔"

شیخ صاحب نے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ انھیں محسوس ہوا کہ کپڑے واقعی بہت ملائم اور چکنے ہیں۔ غیر ارادی طور پر ان کا ہاتھ اپنے پھٹے پرانے "جبے" کی طرف اُٹھ گیا۔ "جبے" کا کھردرا پن اور جگہ جگہ لگے ہوئے پیوند بُری طرح کھٹکنے لگے۔ پھر اچانک ہی وہ چلّا کر بولے :-

تو میری اجازت کے بغیر یہ کپڑے گھر کیوں لائی ہے، میں ہرگز قیمت ادا نہیں کروں گا۔ آخر تو مجھے سمجھتی کیا ہے ۔؟ فوراً یہ کپڑے واپس کردو، ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا ۔"

"میں کپڑے واپس نہیں کروں گی ۔" بیوی غصّے سے بولی ۔

" یہ تو کیا کہہ رہی ہے ۔ ؟

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں ۔ آپ کا یہ رویّہ میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے ۔ آپ دنیا جہان پر بخشش کا مینہ برسا رہے ہیں، لیکن میں اور میرے بچّے محروم ہیں، آخر یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

" خاموش رہو ۔" شیخ صاحب چنگھاڑ کر بولے ۔

" میں اب خاموش نہیں رہوں گی ۔ جو میرے جی میں آئے گا کہوں گی ۔ میں نے بہت دیر تک صبر کیا ہے ۔" یہ کہہ کر اس نے گٹھری اُٹھائی اور کمرے کی طرف چل دی ۔ شیخ صاحب اس کے پیچھے لپکے اور گٹھری چھیننے کی کوشش کرنے لگے ۔ کچھ دیر کھینچا تانی ہوتی رہی ۔ آخر شیخ صاحب کو غصہ آ گیا ۔ وہ پوری قوت سے گٹھری پر ٹوٹ پڑے اور کپڑوں کو پھاڑنے لگے ۔

" یہ کیا کر رہے ہیں آپ ۔ ؟ بیوی نے خوفزدہ ہو کر کہا

" تو کبھی انھیں استعمال نہیں کر سکے گی، میں انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا ۔" شیخ صاحب ہانپتے ہوئے بولے ۔

بیوی، بے چاری عورت ذات تھی کہاں تک ان سے ہاتھا پائی کرتی ۔ تنگ آ کر فرش پر بیٹھ گئی اور زور زور سے رونے لگی ۔ شور سن کر ہمسائے جمع ہو گئے اور بیچ بچاؤ کرانے لگے ۔ شیخ صاحب لوگوں کی طرف دیکھ کر بولے :-

میں اللہ کے مال کو اس بے دردی سے اپنے خاندان پر کیوں کر صرف کر سکتا ہوں ۔ ہمیں دنیا کی نعمتیں نہیں چاہئیں، ہمیں آخرت میں اجر کی خواہش ہے ۔"

تھوڑی دیر بعد ذرا سکون ہوا تو شیخ صاحب جائے نماز کی طرف بڑھے، لیکن پھر کچھ سوچ کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے تاکہ ذرا تازہ ہوا میں سانس لے سکیں ۔ شیخ صاحب دنیا و ما فیہا سے بے خبر چلے جا

رہے تھے۔ ان کے دماغ میں خیالات کا ایک طوفان برپا تھا۔ بار بار وہ اپنے آپ سے دریافت کرتے
"مجھے کیا کرنا چاہئے، کیا مجھے بیوی کے سامنے ہتھیار ڈال دینے چاہئیں جو مجھے اپنے اصلی راستے سے
ہٹانا چاہتی ہے۔ کبھی وہ سوچتے ــــ کہیں وہ خود پر اور اپنے اہل و عیال پر زیادتی تو نہیں کر رہے
ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ نے مادی آسائشیں اس لئے بہم نہیں پہنچائیں کہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے ــ کیا
مال و دولت اس دنیا کی زینت نہیں۔ دن بھر وہ انہی خیالات میں غلطاں رہے، یہاں تک کہ
رات آگئی۔ کھانے کے بعد جب وہ بستر پر لیٹے، تو طرح طرح کے خواب انھیں پریشان کرنے لگے۔
انھوں نے دیکھا کہ ان کی بیوی اور بچے" وہی کپڑے پہنے کھڑے ہیں جنہیں دن میں وہ پھاڑ چکے تھے۔
وہ سب کتنے خوبصورت لگ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر زندگی کی مسکراہٹیں رقص کر رہی تھیں۔

اگلے دن صبح سویرے شیخ صاحب بازار گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ گھر لوٹے، تو ان کی
بغل میں ایک گٹھری تھی وہ بیوی بچوں کے لئے نہایت اعلیٰ اور بیش قیمت کپڑے خرید لائے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک شاندار جبہ پہنے مغرورانہ انداز میں گھر سے نکلے۔" بھوکا سائل" مانگنے
کے لئے آیا، تو انھوں نے اسے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔ ضرورت مندوں کے ہجوم میں سے وہ گردن اکڑائے
گزر گئے۔

دوپہر کے کھانے کے لئے جب وہ بیوی بچوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھے، تو ان کے سامنے
نہایت عمدہ کھانے چنے تھے۔ سب نے نئے نئے کپڑے پہن رکھے تھے، ان کی آنکھیں مسرت سے
چمک رہی تھیں۔

اس دن سے شیخ ابوالبرکات اپنے اہل و عیال کے ساتھ عیش و عشرت کی زندگی بسر
کرنے لگے۔ ضرورت مندوں کو اب انھوں نے گداگر کا خطاب دیا تھا اور ان کے لئے اپنے گھر کے
دروازے بند کر دیئے تھے۔ جب بھی وہ ان سائلوں اور بھکاریوں کی بات کرتے، تو انھیں "نکمے
اور کام چور" کے الفاظ سے یاد کرتے۔ بقول ان کے ان لوگوں نے رزق حلال کے لئے جد و جہد ترک
کر کے ذلت اور پسپائی کی زندگی بسر کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ جب کبھی کوئی بے تکلف دوست شیخ صاحب
سے "اللہ کے مال"، کے متعلق پوچھتا، جو انھیں حاجت مندوں پر خرچ کرنے کے لئے ملا تھا، تو وہ
کچھ دیر کے لئے گہری سوچ میں ڈوب جاتے، پھر سر اٹھا کر اپنے مخصوص انداز میں کہتے:۔

در اصل میں ایک ایسا عظیم منصوبہ بنا رہا ہوں جو تمام معاشرے کی اصلاح کرے گا۔ اس
کے لئے وقت اور غور و فکر کی ضرورت ہے۔

نادر و نایاب تحفے
روغن برق رجسٹرڈ
ہیون کیمیکل ورکس
کی
کامیاب
ایجاد
گھر کا ڈاکٹر
ہر قسم کے درد۔ چوٹ۔ موچ۔ ورم۔ زخم۔ دردسر۔ درد چشم
اعصابی تکالیف۔ بچھو بھڑ کے ڈنک۔ درد کمر۔ خشتہ
میٹھوا۔ درد کان درد دانت۔ درد پسلی۔ سوکھا روگ
نزلہ۔ زکام۔ گھٹنوں کا درد۔ ورم طحال۔ درد گردہ۔ درد سینہ۔ اعصابی کمزوری
نمونیہ۔ جلنے اور کٹنے کے لئے بہت مجرب اور زود اثر ثابت ہوا ہے۔
قیمت فی شیشی ۴۰ پیسہ، ۸۰ پیسہ، ایک روپیہ ۴۰ پیسہ، دو روپیہ ۵۰ پیسہ
روغن سملبائی
پورے اور آدھے سر کے درد اور ایسے دردسر کے
لئے جو سورج کے بڑھنے اور گھٹنے کے ساتھ بڑھتا اور
گھٹتا ہو اور آنکھوں کے ڈھیلوں میں شدت کا
درد ہو، حد درجہ مفید ہے۔
ہزاروں لاکھوں اشخاص نے اس خداداد نعمت سے
شفا حاصل کی ہے۔ آپ بھی استعمال کریں اور
قدرت خداوندی کا کرشمہ دیکھیں۔
قیمت فی شیشی ۹۰ پیسہ، ایک روپیہ ۵۰ پیسہ، ۲ روپیہ ۷۵ پیسہ
لاکھوں
مریض
شفایاب
ہو چکے
ہیں
قمرالدین بدرالدین پرفیومرس
چوک الہ آباد ۳

صنم کدہ
کی
اولین پیش کش
بہو بیگم
ہدایت:۔ ایم صادق
نغمے:۔ ساحر
موسیقی:۔ روشن
کہانی:۔ جاں نثار اختر
عکاسی:۔ ثریمان ایرانی
ایسٹ مین کلر میں
سرزمین اودھ کی حویلیوں کی داستان جن کے دروازوں پر کبھی ہاتھی جھولتے تھے اور نوبت بجا کرتی تھی ـــ لیکن آج گردش زمانہ کے ہاتھوں اُن کے در و دیوار مسمار ہو چکے ہیں اور عظیم کھنڈروں سے حسرت برس رہی ہے۔
ستارے
مینا کماری
اشوک کمار
پردیپ کمار

زردے کے موجد
احمد حسین دلدار حسین پرائیوٹ لمیٹڈ
چوک لکھنؤ
کا
تیار کردہ
زردہ
قوام
گولی
پان کی جان ہے
اسکی لذت شروع سے آخر تک یکساں قائم رہتی ہے
احمد حسین دلدار حسین پرائیوٹ لمیٹڈ
ہیڈ آفس ۔ چوک لکھنؤ
فون نمبر ۲۵۳۱۷
کارخانہ ۔ عبدالعزیز روڈ ۔ لکھنؤ
فون نمبر ۲۵۹۵۸

JANUARY 1967
FASANA (URDU MONTHLY) VOL. I—VIII
ALLAHABAD. Price 75 p. Regd. No. L—420
Registered with the Rgistrar of Newspapers for India at No. 9775/64